تصدرها:
المكتبة العلمية
١٥- ليك روڈ، لاہور
للطباعة والنشر والتوزيع
مغربی پاکستان

مطالعۂ علوم اسلامیہ

# من الهدايه

پروفیسر غازی احمد

ایم اے (عربی، گولڈ میڈلسٹ)

ایم اے (علوم اسلامیہ گولڈ میڈلسٹ)

ایم۔ او۔ ایل۔ بی۔ ایڈ

مولوی فاضل (میڈلسٹ)

منشی فاضل۔ فاضل درس نظامی

المكتبة العلمية

۱۵۔ شارع مدرسة البنات، لاهور

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## كِتَابُ الْحَجِّ

# حج کا بیان

**مسئلہ نمبر ۱ :** حج ایسے لوگوں پر واجب ہے جو آزادی(۱) کی نعمت سے بہرہ ور ہوں . حد(۲) بلوغت کو پہنچ چکے ہوں . عقل(۳) و دانش سے فیض یاب ہوں . صحت(۴) و تندرستی سے مستفیض ہوں . نیز اخراجات(۵) اور سواری پر قادر ہوں . (اخراجات پر قادر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ) حج سے لوٹ کر آنے تک اپنے اهل وعیال کے نفقے، ضروری امور کے انتظام اور سکونت وغیرہ کے بندوبست کے لیے (اخراجات حج کے علاوہ) معقول رقم ہو . (تا کہ اس کے اہل خانہ کو اس کی غیرحاضری میں کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا نہ ہو) (مذکورہ بالا پانچ شرائط کے علاوہ وجوب حج کی چھٹی شرط یہ ہے کہ) راستہ(۶) پرامن ہو .

مصنف ؒ نے حج کے لیے ”لفظ واجب“ استعمال کیا ہے حالانکہ یہ ایک ایسا محکم اور قطعی فریضہ ہے . جس

کی فرضیۃ کتاب اللہ کے ارشاد "وللہ علی الناس حج البیت" سے عیاں ہے۔ (اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مصنفؒ نے لفظ "واجب" کو اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ وجوب سے مراد لزوم ہے جس میں فرضیۃ کے معنے موجود ہیں)۔

**مسئلہ نمبر ۲** : حج تمام عمر میں صرف ایک بار فرض ہے۔ اقرع بن حابسؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! کیا حج ہر سال فرض ہے یا صرف ایک بار" ؟ آپ نے فرمایا : (ہر سال) نہیں۔ بلکہ صرف ایک مرتبہ ہی"۔

اگر کوئی شخص ایک بار سے زائد حج کرے تو وہ زائد حج نفلی ہوگا۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حج کے واجب ہونے کا سبب "بیت اللہ" ہے۔ اور سبب یعنی بیت اللہ واحد ہے اس میں تعدد یا تکرار نہیں اس لیے وجوب بھی متعدد و متکرر نہ ہوگا۔ (کیونکہ جب سبب ہی میں تعدد نہ ہو تو مسبب بھی متعدد نہیں ہوا کرتا اور بیت اللہ چونکہ واحد ہے اس لیے حج کا وجوب بھی ایک بار ہی ہوگا)۔

**مسئلہ نمبر ۳** : امام ابو یوسفؒ کی رائے میں حج فوری طور پر واجب ہوتا ہے (یعنی جس سال حج کی

جملہ شرائط موجود ہوں اسی سال حج کرنا ضروری ہوگا ۔ امام احمدؒ ، امام کرخیؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ امر مطلق سے وجوب علی الفور ثابت ہوتا ہے)۔

امام ابو حنیفہؒ کے ارشادات سے بھی امام ابو یوسفؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے (کافی میں مذکور ہے کہ ایک مالدار شخص نے امام اعظمؒ سے پوچھا : میں پہلے شادی کروں یا حج کے فرائض انجام دوں ۔ امامؒ نے حج پہلے کرنے کی نصیحت فرمائی ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ امام اعظمؒ بھی وجوب علی الفور کے قائل تھے) ۔

امام محمدؒ اور امام شافعیؒ وجوب علی التراخی کے قائل ہیں کیونکہ حج وظیفۂ عمر ہے ۔ (یعنی ساری عمر میں صرف ایک بار حج کی ادائیگی فرض ہے (عمر کو اس مسئلے میں وہی حیثیت حاصل ہوگی جو وقت کو نماز میں ہوتی ہے (جس طرح آخر وقت تک نماز کی ادائیگی ممکن ہوتی ہے اسی طرح تمام عمر میں موت سے پہلے پہلے کسی ذوالحجۃ میں حج کی ادائیگی بھی ممکن ہوگی ۔ مذکورہ اختلاف کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص پر ۱۹۷۱ء میں حج فرض ہوا ۔ لیکن فریضۂ حج کی ادائیگی سے پہلے ہی وہ ۱۹۷۲ء میں فوت ہوگیا تو اس تاخیر کی بناء پر وہ سب کے نزدیک گناہگار ہوگا ۔ لیکن اگر وہ شخص زندہ رہے اور کئی سال بعد حج کرے ۔ تو امام

اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تأخیر کی بناء پر گناہگار ہوگا . لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک کوئی حرج نہیں) .

مذکورہ دلیل کے جواب میں امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ حج کا تعلق مخصوص اور معین اوقات سے ہوتا ہے اور سال کے (طویل عرصے کے) دوران موت کا وقوع پذیر ہونا کوئی امر محال نہیں . (ممکن ہے کہ فریضۂ حج کی ادائیگی سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلا جائے) . اس لیے احتیاط کے مدنظر ادائیگی میں تأخیر مناسب نہ ہوگی . بلکہ تعجیل افضل ہوگی بخلاف وقت نماز کے کہ اتنے قلیل عرصے میں موت کا وقوع شاذ و نادر ہی ہوتا ہے (اس لیے نماز کی ادائیگی آخر وقت تک جائز ہوتی ہے) .

مصنفؒ نے حریت اور بلوغت کو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی بناء پر شرط قرار دیا ہے کہ "اگر کوئی شخص غلامی کی حالت میں دس بار بھی حج کرے لیکن پھر نعمت آزادی سے بہرہ ور ہوجائے تو اس پر حج فرض لازم ہوگا . اسی طرح اگر ایک بچہ (بچپن کی حالت میں) دس مرتبہ بھی سعادت حج سے بہرہ مند ہو لیکن بالغ ہونے کے بعد اس پر فرض حج کی ادائیگی ضروری ہوگی" .

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حج عبادت ہے اور عبادات بچوں پر فرض نہیں ہوا کرتیں .

احکام شرعیہ کا مکلف ہونے کے لیے عقل بھی شرط کی حیثیت رکھتی ہے (کیونکہ عاقل ہونے کی بناء پر ہی انسان أحکام شرعیہ اور عبادات کا مکلف ہوتا ہے ورنہ دیوانے اور مجنون تو مرفوع القلم ہوتے ہیں) . اسی طرح اعضاء بدن کا صحیح وسالم ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ صحت وسلامتی نہ ہونے کی صورت میں تو انسان عاجز و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے (اور عاجز آدمی احکام کی بجاآوری سے معذور ہوتا ہے) .

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ کسی اندھے شخص کو اگر کوئی ایسا معاون میسرآجائے جو سفر کی تمام ذمہ داریاں قبول کرے اور وہ اندھا اخراجات اور سواری پر بھی قادر ہو تو اس پر حج فرض ہوگا .

صاحبینؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے اس مسئلے پر تفصیلاً بحث کتاب الصلاۃ میں گزر چکی ہے . (باب الجمعۃ میں مذکور ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک وہ قدرت قابل اعتبار نہیں ہوتی جو کسی شخص کو ذاتی طور پر حاصل نہ ہو بلکہ کسی دوسرے کے تعاون پر منحصر ہو . صاحبینؒ کے نزدیک یہ بالواسطہ قدرت بھی قابل اعتبار ہے) امام اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق اپاہج پر حج واجب ہے کیونکہ وہ دوسرے شخص کے تعاون کی بناء پر صاحب استطاعت شمار ہوگا پس یہ اس شخص کی مانند ہوگا جو سواری کے ذریعے استطاعت رکھتا

ہو (امام اعظمؒ کی اس روایت کی بنا پر تو اندھے پر بھی حج واجب ہونا چاہیے کیونکہ اندھے کو بھی دوسرے کے تعاون کی بناء پر صاحب استطاعت کہا جا سکتا ہے بعض علماء نے امام کے اس قول کی یوں تأویل کی ہے کہ اپاہج شخص بغیر کسی قائد کے سواری پر بیٹھ کر افعال حج ادا کر سکتا ہے مگر اندھا آدمی کسی قائد اور معاون کے سوا کچھ نہیں کر سکتا . لہذا دونوں صورتوں میں فرق واضح ہے) .

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اپاہج پر حج واجب نہ ہوگا کیونکہ وہ بذات خود افعال حج کی ادائیگی پر قادر نہیں ہوتا بخلاف اندھے کے کہ اگر اس کی راہنمائی کی جائے تو وہ بذات خود ارکان حج ادا کر سکتا ہے یہ اس شخص کی طرح ہوگا جو راستہ بھول جائے . (یعنی اگر کوئی شخص حج کی نیت سے مکة المکرمة جاتے ہوئے راہ بھول جائے تو اس سے فریضۂ حج ساقط نہیں ہوتا کیونکہ کسی شخص کے راستہ بتا دینے سے وہ مکة المکرمہ پہنچ کر حج کر سکتا ہے . ایسے ہی اندھا شخص بھی دوسرے آدمی کی رہبری اور تعاون سے افعال حج کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے) .

اخراجات اور سواری پر قدرت ہونا بھی ضروری ہے . زاد سے مراد یہ ہے کہ وہ اونٹ کے کجاوے کی ایک جانب یا پورا اونٹ کرائے پر لے سکے اور

آمدورفت اور دیگر ضروری اخراجات کی کفالت کر سکے۔ (ہمارے ملک سے حج پر جانے والے حضرات سمندری یا ہوائی راستے سے جدہ پہنچتے ہیں اور جدہ سے آگے بذریعہ بس یا کار سفر طے کرتے ہیں۔ اس لیے اخراجات کا اندازہ سفر کے ذرائع کے مطابق کیا جائے گا)۔

آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا (کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وللہ علی الناس حج البیت من استطاع إلیہ سبیلاً" میں) سبیل سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زاد اور راحلہ۔ یعنی خرچ اور سواری۔ اگر کوئی شخص سواری پر چڑھنے کی باری کرائے پر لے سکے (یعنی۔ ایک مرتبہ وہ سوار ہو اور دوسری بار دوسرا شخص) تو اس پر حج واجب نہ ہو گا کیونکہ جب اسے اپنی باری پر سوار ہونا ہے۔ تو پورے راستے میں سواری پر قادر ہونا نہ پایا گیا۔ (بلکہ نصف راستے میں اسے سواری پر قدرت حاصل ہوئی)۔

زاد میں یہ بھی شرط ہے کہ وہ مسکونت اور دیگر ضروریات۔ مثلاً نوکر چاکر، گھر کے سازوسامان اور لباس وغیرہ سے زائد ہو۔ کیونکہ یہ اشیاء تو بنیادی ضروریات میں داخل ہیں نیز زاد کا اس کی واپسی تک اہل وعیال کے اخراجات سے زائد ہونا بھی شرط ہے۔ کیونکہ نان ونفقہ عورت کا حق واجب ہے اور شرعی احکام کے مطابق حقوق العباد، حقوق اللہ پر مقدم ہوتے ہیں

اهل مکہ اور گرد و نواح میں رہنے والوں کے لیے سواری وجوب حج کی شرائط میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ اگر پیدل چل کر بھی حج کر لیں تو انھیں کسی خاص دقت اور مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا . لہذا ان کا یہ سفر سعی إلی الجمعة کے مشابہ ہوگا (یعنی جس طرح سعی إلی الجمعة کے لیے سواری شرط نہیں اسی طرح ان مذکورہ لوگوں کے لیے بھی سواری کا میسر ہونا ضروری نہیں) .

راستے کا پر امن ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر استطاعت ثابت نہیں ہوتی . ابو شجاع نے امام اعظمؒ سے روایت کیا ہے کہ راستے کا پر امن ہونا وجوب حج کی شرط ہے . حتی کہ (موت کی صورت میں) اس پر وصیت واجب نہ ہوگی (امام شافعیؒ اور امام کرخیؒ کا بھی یہی قول ہے) .

ابو حاتم کی روایت کے مطابق راستے کا پر امن ہونا وجوب کی شرط نہیں بلکہ ادا کی شرط ہے . (امام محمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں) کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے استطاعت کی تفسیر میں خرچ اور سواری ہی کا ذکر فرمایا تھا کسی دیگر امر کا اضافہ نہیں فرمایا . (اگر راستے کا پرامن ہونا بھی وجوب کی شرط ہوتا تو آپ ضرور اس کا تذکرہ فرماتے . اس اختلاف کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہو جائے

پہلے قول کے مطابق اس پر وصیت کرنا لازم نہ ہوگا
لیکن دوسرے قول کے پیش نظر مرنے والے کے ذمے
وصیت کرنا ضروری ہوگا کہ اس کے ترکہ سے
اخراجات حج علیحدہ کر لیے جائیں اور کوئی دوسرا
شخص اس کی طرف سے فریضۂ حج ادا کر دے).

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں : عورت کے لیے
ضروری ہے کہ وہ خاوند یا محرم کی معیت میں حج
کرے. اگر اس کے گھر اور مکۂ مکرمہ کے درمیان
تین دن سے زائد سفر ہو تو اس کے لیے خاوند یا محرم
کے بغیر حج کرنا جائز نہ ہوگا.

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر عورت ایک
ایسی جماعت کی رفاقت میں حج کے لیے جائے کہ جس میں
قابل اعتماد عورتیں بھی شامل ہوں تو (خاوند یا محرم کے
علاوہ بھی حج کرنے میں) کوئی ھرج نہیں فساد کا
ایسی قابل اعتماد عورتوں کی معیت میں فتنہ و کیونکہ
اندیشہ نہیں رہتا .

ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ
"کوئی عورت محرم کی معیت کے سوا حج نہ کرے"
اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنے محرم کے بغیر
ہر آن فتنہ و فساد کا خدشہ درپیش ہوتا ہے اور
دوسری عورتوں کے ساتھ میل جول سے تو وقوع فتنہ

کا امکان زیادہ ہوتا ہے . اسی لیے اجنبی عورت کے ساتھ خلوت اور تنہائی (میں اکھٹا ہونا) حرام ہے . خواہ اس کے ساتھ دوسری عورت بھی ہو . بخلاف اس صورت کے جب کہ اس کے گھر اور مکہ مکرمہ کے درمیان تین دن سے کم سفر ہو کیونکہ شرعی سفر کی مقدار سے کم فاصلے پر بغیر محرم کے جانا جائز ہے .

مسئلہ : اگر عورت کا محرم ساتھ ہو تو خاوند اسے حج پر جانے سے نہیں روک سکتا . امام شافعیؒ کے نزدیک خاوند کو روکنے کا حق حاصل ہے کیونکہ اس کی مرضی کے خلاف جانے میں اس کے حقوق ضائع ہوتے ہیں . علماء احناف فرماتے ہیں کہ مرد کا حق فرائض شرعیہ میں اثر انداز نہیں ہو سکتا اور حج بھی فرائض شرعیہ سے ہے . البتہ اگر نفلی حج ہو تو خاوند منع کر سکتا ہے .

مذکورہ صورت میں اگر محرم فاسق و فاجر ہو تو عورت کے لیے اس کے ساتھ حج پر جانا ضروری نہیں . کیونکہ اس صورت میں اصل مقصد (یعنی عورت کی عصمت وعفت) کا حاصل ہونا یقینی نہیں .

مسئلہ : عورت ہر محرم کے ساتھ سفر حج اختیار کر سکتی ہے مگر جب محرم مجوسی عقائد کا حامل ہو (تو اس کے ساتھ سفر نہ کرے) کیونکہ مجوسی تو

محرمات کے ساتھ بھی نکاح کرنے کے قائل ہوتے ہیں ۔
اگر محرم بچہ یا مجنون ہو تو اس کے ساتھ سفر پر جانا جائز نہ ہوگا کیونکہ وہ حفاظت و صیانت کے فرائض سر انجام دینے کی اہلیت سے عاری ہوتے ہیں ۔ وہ بچی کہ جس میں جنسی جذبات پیدا ہو چکے ہوں بمنزلہ بالغ عورت کے ہے یعنی وہ بھی محرم کے بغیر سفر پر نہیں جا سکتی ۔

محرم کے اخراجات عورت کے ذمہ ہوں گے کیونکہ وہ اس کے حج کی ادائیگی کا وسیلہ بن رہا ہے (اس لیے وہ اپنے اخراجات کا ذمہ دار خود نہ ہوگا بلکہ عورت سے وصول کرے گا) ۔

محرم کی معیت وجوب حج کی شرط ہے یا اداء حج کی ؟ اس میں فقہاء کا وہی اختلاف ہے جو راستے کے پر امن ہونے کے بارے میں تھا ۔

**مسئلہ** : اگر احرام باندھنے کے بعد بچہ حد بلوغت کو پہنچ جائے ، یا احرام باندھنے کے بعد غلام کو آزادی حاصل ہو جائے تو یہ دونوں اس حج کی (جس کے لیے انہوں نے احرام باندھا تھا) تکمیل کریں ۔ لیکن یہ ادائیگی فرض حج کے قائم مقام نہ ہوگی ۔ کیونکہ انہوں نے نفلی حج کی ادائیگی کے لیے احرام باندھا تھا ۔ لہذا اسے حج فرض کی ادائیگی سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا ۔

**مسئلہ** : اگر بچہ وقوف عرفہ سے پہلے پہلے احرام کی تجدید کرکے حج فرض کی نیت کرلے تو جائز ہوگا. مگر غلام کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ عدم اهلیة کی بناء پر بچے کا احرام لازم نہیں ہوتا . (کیونکہ اس پر حج فرض نہیں ہوتا چنانچہ افعال حج کی ادائیگی میں کسی غلطی کا مرتکب ہو ، تو اس پر قربانی یا روزوں کی صورت میں تاوان واجب نہیں ہوتا) . لیکن غلام کا احرام لازم ہوتا ہے (اور اگر وہ حج کے دوران کوئی غلطی کرے تو اسے روزے رکھ کر کفارہ دینا ہوتا ہے) . لہذا اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایک امر کی ابتدا کرکے (اسے مکمل کیے بغیر) دوسرے امر کو شروع کردے . واللہ اعلم

——:o:——

# فصل

## میقات کے بیان میں

**مسئله** : میقات ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں سے انسان کے لیے احرام کے بغیر گزرنا ممنوع ہے. اور یہ پانچ ہیں. اھل مدینه کے لیے ذوالحلیفه ، اھل عراق کے لیے ذات عرق ، اھل شام کے لیے جحفه ، اھل نجد کے لیے قرن اور اھل یمن کے لیے یلملم میقات ہے. نبی اکرم ﷺ نے مذکورہ لوگوں کے لیے مذکورہ مقامات ہی کو میقات قرار دیا تھا.

میقات مقرر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان مقامات سے تجاوز کرتے ہوئے احرام باندھنے کو مؤخر نہ کیا جائے. البته ان مقامات سے پہلے احرام باندھ لینا بالاتفاق جائز ہے.

**مسئله** : جب کوئی آفاقی (یعنی ان مذکورہ مواقیت سے باہر رہنے والا) ان مقامات پر پہنچے اور مکه مکرمه میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو احرام باندھ لے خواہ حج کا ارادہ ہو یا عمرے کا یا کسی کا بھی نہ ہو . یہ احناف کا مسلک ہے . نبی اکرم ﷺ کا

ارشاد ہے کہ کوئی شخص بھی احرام کے بغیر میقات سے تجاوز نہ کرے. (اس حدیث میں حج یا عمرے یا دونوں کی کوئی شرط نہیں. امام شافعیؒ کا ارشاد ہے، کہ اگر حج یا عمرے کا ارادہ ہو تو میقات سے احرام ضروری ہے. ورنہ نہیں).

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وجوب احرام اس بقعۂ مقدسہ کی تعظیم و توقیر کے پیش نظر ہے، تو اس لحاظ سے حج کرنے والا یا عمرہ کرنے والا یا ان کے علاوہ دوسرے اشخاص سب برابر ہوں گے. ( کیونکہ مکہ معظمہ کی تعظیم کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے).

**مسئلہ** : جو شخص میقات کی اندرونی حدود میں سکونت پذیر ہو، وہ ضرورت کے تحت مکۂ مکرمہ میں احرام کے بغیر داخل ہو سکتا ہے کیونکہ اسے کئی بار مکہ مکرمہ میں آنا جانا ہوتا ہے اور ہر بار احرام واجب کرنے میں اسے اچھی خاصی دقت کا سامنا ہوگا. لہذا وہ اہل مکہ کی طرح ہوگا اور اہل مکہ کے لیے ضرورت کے تحت مکہ مکرمہ سے باہر آنا اور بغیر احرام واپس جانا مباح ہے. (اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی مکہ مکرمہ میں بغیر احرام داخل ہونا مباح ہوگا جو میقات کی اندرونی حدود میں سکونت پذیر ہیں). ہاں اگر وہ (یعنی حدود میقات کے اندر رہنے والا) حج کی ادائیگی

کا ارادہ کرے (تو احرام کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہو) کیونکہ ایسا ارادہ کبھی کبھار ہوتا ہے اس لیے حج کی صورت میں احرام لازم کرنے میں کسی خاص تکلیف اور مشقت کا سامنا نہیں ہوتا (یعنی حج اور عمرہ روز روز تو نہیں ہوا کرتے بلکہ کبھی کبھار ہی موقعہ میسر آتا ہے لہذا اس صورت میں احرام کی شرط لگانے میں کوئی حرج نہ ہوگا) ۔

**مسئلہ** : اگر مذکورہ مقامات سے پہلے ہی احرام باندھ لیا جائے تو جائز ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ**،، اتمام حج وعمرہ کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے روانہ ہوتے ہی احرام باندھ لیا جائے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے ایسے ہی منقول ہے اور بہتر یہی ہے کہ احرام میقات سے پہلے ہی باندھ لیا جائے ۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں اتمام حج کی تفسیر اسی امر سے کی گئی ہے ۔ نیز اس صورت میں پابندی اور مشقت بھی زیادہ ہے (اور عبادت کا اجر مشقت کے مطابق ہی ہوا کرتا ہے) اور تعظیم کا پہلو بھی نمایاں ہے (کہ احترام بیت اللہ کے مدنظر گھر سے روانگی کے وقت ہی احرام باندھ لیا جائے) ۔

امام اعظمؒ کا ارشاد ہے کہ گھر سے احرام باندھنا اس صورت میں افضل ہوگا جبکہ اسے اپنے آپ

پر قابو حاصل ہو اور کسی ممنوع امر کے ارتکاب کا خدشہ نہ ہو۔

مسئلہ : جو شخص حدود میقات کے اندر سکونت پذیر ہو اس کا میقات مقام حِل ہے حل سے مراد وہ جگہ ہے۔ جو میقات اور حرم کے درمیان ہے۔ کیونکہ اسے گھر کی حدود سے احرام باندھنا جائز ہے اور میقات سے حرم تک گویا ایک ہی مکان ہے۔ (تو وہ میقات کے اندر جہاں سے بھی احرام باندھے گا اسے گھر ہی سے تصور کیا جائے گا)۔

مسئلہ : جو شخص مکہ مکرمہ میں سکونت رکھتا ہو حج کے سلسلے میں حدود حرم اس کا میقات ہوں گی اور عمرہ کے لیے حل۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ حج کے لیے وسط مکہ سے احرام باندھیں اور حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمنؓ سے فرمایا کہ اپنی بہن عائشہؓ کو تنعیم لے جائیں تاکہ وہ وہاں سے احرام باندھ سکیں۔ تنعیم حل کی حدود میں ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حج کی ادائیگی عرفات میں ہوتی ہے اور عرفات حل میں ہے۔ اس لیے حدود حرم سے احرام باندھنے کو کہا گیا۔ تا کہ کسی حد تک سفر کی صورت متحقق ہو جائے اور عمرہ کی ادائیگی کا مقام حرم ہے لہذا حل سے احرام باندھنا مناسب ہوگا (تا کہ سفر سے کچھ مشابہۃ ہو جائے) تمام حل سے احرام

باندھا جا سکتا ہے . مگر تمام تنعیم سے احرام باندھنا افضل ہے کیونکہ اس بارے میں حدیث بیان کی جا چکی ہے . (یعنی حضرت عائشہ رض کو تنعیم لے جانا اور وہاں سے احرام باندھنا) . واللہ اعلم

——:o:——

# بَابُ الْإِحْرَام

# احرام کا بیان

**مسئلہ :** جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو غسل کر لیا جائے یا کم از کم وضو ، لیکن ترجیح غسل کو ہوگی . نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے . کہ آپ ﷺ نے احرام باندھنے سے قبل غسل فرمایا تھا . البتہ یہ غسل نظافت و صفائی کے پیش نظر ہے . حتی کہ حائضہ عورت کو بھی احرام کے لیے غسل کرنے کو کہا جائے گا . اگرچہ بوجہ حیض اس کے لیے ضروری نہیں ہے . (یعنی احرام کے لیے غسل، غسل جنابت کی طرح واجب نہیں ہوتا) تو وضو بھی اس (غسل مستحب) کا قائم مقام ہو سکتا ہے . جیسا کہ نماز جمعہ کے لیے (جمعہ کے روز غسل مسنون ہے ، لیکن اگر غسل نہ کیا جائے تو صرف وضو سے بھی نماز جمعہ کی ادائیگی درست ہوگی) . بہر صورت غسل کو فوقیت ہوگی ، کیونکہ غسل سے (بنسبۃ وضو) نظافت کامل طور پر حاصل ہوتی ہے . علاوہ ازیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی غسل ہی کو اختیار فرمایا تھا .

**مسئلہ** : امام قدوری ؒ فرماتے ہیں کہ (غسل یا وضو کے بعد) دو نئے یا دھلے ہوئے کپڑے زیب تن کرے . (احرام دو چادروں پر مشتمل ہوتا ہے ایک چادر نیچے باندھنے کے لیے اور دوسری بدن پر لپیٹنے کے لیے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام کے لیے ایک چادر باندھ لی تھی اور دوسری بدن پر اوڑھ لی تھی .

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ (احرام کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا ممنوع ہے اور ساتھ ہی ستر عورت بھی ضروری ہے . نیز گرمی اور سردی کے اثرات سے بچاؤ بھی لازم ہے . جس لباس کا ہم نے ذکر کیا ہے (یعنی دو چادریں) اس سے یہ تمام مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں .

نئے کپڑے کو زیادہ فضیلت ہے کیونکہ اس میں طہارۃ و نظافت زیادہ ہوتی ہے .

**مسئلہ** : امام قدوری ؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے پاس خوشبو ہو تو ضرور استعمال کرے . امام محمد ؒ کا قول ہے کہ ایسی خوشبودار چیز کا استعمال کرنا جو احرام کے بعد بھی جسم پر لگی رہے مکروہ ہے . امام مالک ؒ اور امام شافعی ؒ کی بھی یہی رائے ہے . کیونکہ مذکورہ بالا صورت میں انسان احرام کے بعد

بھی خوشبو سے متمتع ہوتا رہتا ہے اور یہ روا نہیں (کیونکہ احرام کے بعد خوشبو کا استعمال ممنوع ہے) .

مشہور قول کی دلیل میں حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے . آپؓ کا ارشاد ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوشبو لگایا کرتی تھی . نیز دوسری بات یہ ہے کہ (واقعی) احرام باندھ لینے کے بعد خوشبو کا استعمال ممنوع ہے . البتہ اگر پہلے سے لگائی ہوئی خوشبو کچھ باقی رہ جائے تو وہ جسم سے شدید اتصال کی بنا پر جسم کے تابع ہی شمار ہوگی . (کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتی) . سوال : اگر بچی کھچی خوشبو جسم کے تابع شمار کی جا سکتی ہے ، تو کیا سلا ہوا کپڑا احرام سے پہلے پہن لینے کی صورت میں جسم کے تابع نہیں ہو سکتا ؟ صاحب ھدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بخلاف اس سلے ہوئے کپڑے کے جو احرام سے پہلے پہن لیا جائے کیونکہ وہ جسم سے مبائن اور الگ حیثیت رکھتا ہے (اس لیے اسے جسم کے تابع قرار نہیں دیا جا سکتا ہے) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ دو رکعۃ نماز بھی ادا کرے (یہ دو رکعۃ نماز نفل ہوں گی) . حضرت جابرؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے مقام ذی الحلیفہ پر احرام

کے وقت دو رکعۃ نماز پڑھی .

**مسئلہ** : امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ احرام کے وقت یہ دعا پڑھے : "اَللّٰهُمَّ اِنِّی اُرِیْدُ الْحَجَّ فَیَسِّرْہُ لِی وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ" . چونکہ افعال حج کی ادائیگی مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر ہوتی ہے اور عموماً کئی تکلیفوں اور دقتوں کا سامنا ہو جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے آسانی اور سہولت کی التجاء کی گئی .

امام محمدؒ نے نماز کے لیے اس قسم کی دعاء کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ نماز کے لیے قلیل وقت درکار ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی بھی عادۃً آسان ہوتی ہے . (تحفہ میں امام محمدؒ سے نماز کے لیے یہ دعاء بھی منقول ہے :"اَللّٰهُمَّ اِنِّی اُرِیْدُ صَلَاۃَ کَذَا فَیَسِّرْهَا لِی وَتَقَبَّلْهَا مِنِّی") .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ (دو رکعۃ) نماز کے بعد تلبیہ پڑھے . روایت کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد تلبیہ پڑھی . اگر سواری پر بیٹھ جانے کے بعد تلبیہ پڑھے تب بھی جائز ہے (یعنی نماز کے بعد نہ پڑھے بلکہ سوار ہو کر پڑھے) لیکن پہلی صورت میں بوجہ روایت فضیلت ہے .

**مسئلہ** : اگر حج مفرد کرنے کا ارادہ ہو (حج کی تین اقسام ہیں : افراد ، قرن اور تمتع . ان کی تفصیل آئندہ

اوراق میں آرہی ہے) تو تلبیہ کہتے وقت حج کی نیت کرے ۔ کیونکہ حج عبادت ہے اور عبادات و افعال کا مدار نیت پر ہوتا ہے ۔

**مسئلہ** : اور تلبیہ اس طرح کہے۔ **"لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لاَ شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ ، لَا شَرِيْكَ لَكَ"** مصنف ؒ کے قول إن الحمد میں الف مکسور ہے مفتوح نہیں تا کہ یہ جملہ مستقل اور نیا ہو اور ما قبل پر مبنی نہ ہو ۔ کیونکہ فتح کی صورت میں یہ پہلے جملے کی صفت اور اس کے تابع ہوگا (یعنی إن الحمد میں إن بکسر الالف ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس صورت میں إن الحمد الخ مستقل اور نیا جملہ بنتا ہے اور الف مفتوح کی صورت میں ما قبل کی صفت اور دلیل ہوگا ۔ یعنی **لِأَنَّ الْحَمْدَ** الخ ۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ جملے کو مستقل کلام بنایا جائے تا کہ ادبی لحاظ سے کلام میں نفاست موجود رہے ۔

اور یہ تلبیہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی پکار اور دعوت کا جواب ہے جیسا کہ ایک مشہور قصے میں مذکور ہے ۔ (یعنی جب ابراھیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو چکے تو اللہ تعالی کے حضور میں عرض کیا : یا اللہ ! آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے کعبہ کی تعمیر مکمل کر دی ہے ۔

ارشاد ہوا کہ اب اعلان حج کیجیے . اللہ تعالی کی قدرت سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کا اعلان حج زمین کے کونے کونے میں سنائی دیا اور یہ تلبیہ جو حج کے موقع پر کہا جاتا ہے . یہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کے اس اعلان اور پکار کا جواب ہے کہ اے اللہ تیرے خلیل نے حج کے لیے پکارا تھا ہم اس کے جواب میں حاضر ہیں) .

اور مناسب یہ ہے کہ تلبیہ کے (مذکورہ) کلمات میں قطع و برید نہ کرے کیونکہ تمام رواۃ نے بالاتفاق ان کلمات کو اسی طرح روایت کیا ہے لہذا ان کلمات میں کمی نہ کرے . (ہاں) اگر (ان کلمات کے آخر میں چند اور ثنائیہ کلموں کا) اضافہ کرے تو جائز ہوگا .

ربیعؒ نے امام شافعیؒ سے روایت کیا ہے کہ اضافہ جائز نہیں . (مزنیؒ کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ بھی اضافے کے جواز کے قائل تھے) . امام شافعیؒ کلمات تلبیہ کو اذان اور تشہد پر قیاس فرماتے ہیں کیونکہ کلمات تلبیہ بھی ذکر منظوم ہے (یعنی آنحضرت ﷺ سے مخصوص الفاظ کے ساتھ منقول ہیں لہذا اذان اور تشہد کی طرح اس میں بھی اضافہ روا نہ ہوگا) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ بڑے بڑے بزرگ صحابہ مثلاً ابن مسعودؓ ، عبداللہ بن عمرؓ اور ابو ہریرۃؓ

وغیرھم حضرات نے منقول کلمات پر اضافہ فرمایا ہے۔
(صحاح ستہ میں ابن عمرؓ سے یہ اضافہ مذکور ہے) :
(''لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ بِيَدِكَ وَالرَّغْبَاءُ اِلَيْكَ'') ۔

دوسری بات یہ ہے کہ تلبیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اظہار عبودیت ہے ۔ اس لیے اضافے میں کوئی حرج نہیں (بلکہ فضیلۃ ہی زیادہ ہوگی لیکن تشہد کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود مخصوص طور پر دی تھی ۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا سُورَةَ الْقُرْآنِ''۔ لہذا تشہد میں اضافہ جائز نہ ہوگا ۔ یہی صورت اذان کی ہے۔ تلبیہ کے بارے میں ابو داؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب تلبیہ کہی تو لوگوں نے بھی آپؐ کی تقلید کی اور ساتھ ہی ان کلمات کا اضافہ بھی کیا لَبَّيْكَ ذَا الْمَعَارِجِ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع نہ فرمایا) ۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ تلبیہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہی محرم ہو جائے گا بشرطیکہ ساتھ ہی ساتھ نیت کر لے کیونکہ نیت کے بغیر عبادت

کی ادائیگی نہیں ہوتی . امام قدوریؒ نے متن میں نیت
کا ذکر صراحةً اس لیے نہیں کیا کہ پہلے "اَللّٰهُمَّ اِنِّی اُرِیْدُ
الْحَجَّ" میں اشارةً نیت کا ذکر موجود تھا . (کیونکہ
أرید یعنی ارادے سے نیت کا پتا بھی چلتا ہے) [مولانا
عبدالحیؒ فرماتے ہیں کہ صاحب ھدایہ کا یہ کہنا
اِلَّا اَنَّهُ لَمْ یَذْکُرْهَا الخ درست نہیں . کیونکہ امام قدوریؒ
کی اس عبارت "وَاِنْ کَانَ مُفْرِداً بِالْحَجِّ یَنْوِیْ بِتَلْبِیَتِهِ الْحَجَّ"
میں نیت کا ذکر صراحةً موجود ہے) .

**مسئلہ** : انسان صرف نیت کر لینے سے محرم نہیں
بن جاتا جب تک کہ تلبیہ بھی نہ کہے . امام شافعیؒ
کو اس میں اختلاف ہے . (ان کے نزدیک محض نیت کی
بناء پر بھی محرم بن جاتا ہے) . ہماری دلیل یہ ہے کہ
اس نے (چند ایسے افعال جو عبادت کا درجہ رکھتے
ہیں کے) ادا کرنے کی نیت کی ہے . اس لیے (ابتداء میں)
اس کا ذکر ضروری ہوگا جیسا کہ نماز کے لیے تکبیر
تحریمہ ہے .

تلبیہ کے علاوہ ہر اس ذکر سے بھی کہ جس میں
تعظیم کا پہلو موجود ہو ابتداء کرنے والا قرار دیا
جا سکتا ہے . اسی طرح (زبان کی بھی کوئی شرط نہیں) .
ذکر فارسی میں ہو یا عربی میں (یا اپنی مادری زبان

میں دونوں طرح جائز ہوگا). ہمارے اصحاب فقہ کے نزدیک یہی بات مشہور ہے (سوال : امام محمدؒ کے نزدیک فارسی میں نماز جائز نہیں تو ان کے نزدیک فارسی میں تلبیہ کیونکر جائز ہوگی لہذا آپ کا اس مسئلے کو متفق علیہ کہنا کہاں تک درست ہے ؟ صاحب ہدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے کہ) صاحبینؒ کے اصول کے مطابق تلبیہ اور نماز میں فرق موجود ہے . (امام ابو یوسفؒ نے نماز کی ابتداء لفظ تکبیر سے مخصوص کی ہے ، اور امام محمدؒ نے نماز میں عربیة شرط قرار دی ہے مگر تلبیہ میں عربیة کو شرط نہیں کیا) . کیونکہ حج میں بنسبة نماز کے کہیں زیادہ وسعت ہے . حتی کہ حج میں تو غیر ذکر بھی ذکر کا قائم مقام بن جاتا ہے جیسا کہ قربانی کے جانور کو قلادہ ڈالنا (بھی ذکر میں شامل ہے) . اس طرح تلبیہ کے علاوہ دوسرے اذکار بھی جائز ہوں گے اور عربی کے سوا دوسری زبان میں بھی ذکر کرنا درست ہوگا .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جن امور سے منع فرمایا ہے محرم ان سے اجتناب کرے . شہوانی اعمال ، بدعملی اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات اس سے سرزد نہ ہو . اس بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد : "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" اصل کی حیثیت رکھتا ہے . (مذکورہ آیت میں) اگرچہ نفی کا

صیغه استعمال کیا گیا ہے مگر اس سے مراد نہی ہے ۔ (اور کلام کی اس ترکیب سے تأکید مزید ثابت ہوتی ہے ۔ صاحب کفایہ شارح ہدایہ لکھتے ہیں : **فَهٰذَا نَهْیٌ بِصِیْغَةِ النَّفْیِ وَهُوَ آکَدُ مِنَ النَّهْیِ کَأَنَّهٗ قِیلَ وَلَا یَکُنْ رَفَثٌ وَلَا فُسُوقٌ وَلَا جِدَالٌ وَهٰذَا لِأَنَّهٗ لَوْ بَقِیَ اَخْبَارٌ لَتطَرَّقَ الْخُلْفُ فِیْ کَلَامِهٖ تَعَالٰی لِصُدُورِهَا عَنِ الْبَعْضِ)** ۔

رفث سے مراد مباشرت ہے (**کما فی قوله تعالی : اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ الآیة** : ابن عباسؓ ، ابن عمرؓ ، حسن بصریؒ اور زھریؒ نے یہی مراد لیا ہے)؛ یا فحش کلام یا عورتوں کی موجودگی میں مباشرت کی باتیں کرنا ۔ (ابو عبیدہ اسی معنی کے قائل ہیں) ۔

فسوق سے مراد معاصی ہیں (اگرچہ معاصی ہر حالت میں ممنوع اور حرام ہیں لیکن) حالت احرام میں ان کی حرمت بہت شدید ہو جاتی ہے ۔

جدال سے مراد یہ ہے کہ رفقاء سفر سے لڑنے جھگڑنے لگے ۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ حج کے اوقات کی تقدیم و تأخیر کے سلسلے میں مشرکین سے مجادلہ مراد ہے ۔ (اسلام سے قبل مشرکین ذاتی مفادات کی خاطر اوقات حج میں تغیر و تبدل کر دیا کرتے تھے)۔

**مسئلہ :** محرم کے لیے شکار کے جانور کو مارنا بھی ممنوع ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "**وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ**". نہ تو اس کی طرف اشارہ کرے اور نہ کسی کو اس کے متعلق آگاہ کرے۔ حضرت ابو قتادہؓ نے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حمار وحش (جنگلی گدھا) شکار کیا۔ وہ محرم نہیں تھے۔ مگر دوسرے صحابہ احرام باندھے ہوئے تھے۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا : کیا تم نے شکار کے بارے میں اشارہ کیا تھا۔ یا اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا یا اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی تھی؟ صحابہؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا : تب کھا سکتے ہو۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اشارہ یا راہنمائی یا کسی قسم کی اعانت شکار کے پرامن ہونے کی حالت کو زائل کر دیتی ہے۔ ورنہ وہ تو وحشی ہونے کی بناء پر لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے اور امن میں ہوتا ہے۔ (یعنی احرام کی حالت میں شکار کرنا تو کجا شکار کی طرف اشارہ کرکے شکاری کو متوجہ کرنا یا یہ بتانا کہ کس طرف گیا ہے یا شکار کے سلسلے میں کسی قسم کی اعانت کرنا بھی روا نہیں۔ کیونکہ

اشارے یا دلالت یا اعانت سے بھی جانور کا امن جاتا رہتا ہے ، ورنہ وحشی جانور تو اپنی وحشت کی بناء پر خود ہی لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرتا ہے اور پرامن رہتا ہے . لیکن شکاری کو اگر اشارةً یا دلالةً جانور کے متعلق بتا دیا تو گویا جانور کی حالت امن کا ازالہ کر دیا ، اور یہ محرم کے لیے جائز نہیں کہ وہ حالت احرام میں بھی مخلوقِ خدا کے امن و سکون میں مخل ہو) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ محرم نہ تو قمیص پہنے نہ سلوار نہ پگڑی اور نہ موزے ، ہاں اگر جوتے دستیاب نہ ہوں تو موزوں کو ٹخنوں سے نیچے کاٹ کر پہن سکتا ہے . روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے محرم کو ان مذکورہ اشیاء کے استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ موزے بھی نہ پہنے ہاں اگر جوتے میسر نہ ہوں تو موزوں کو ٹخنوں سے نیچے قطع کرلے .

ھشامؒ نے امام محمدؒ سے روایت کیا ہے کہ یہاں کعب سے مراد (پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈی یعنی ٹخنہ نہیں بلکہ) وہ جوڑ ہے جو وسط قدم میں ہوتا ہے اور جہاں تسمہ باندھا جاتا ہے . (یعنی جہاں تک عموماً جوتے کا اوپر والا حصہ آتا ہے) .

**مسئلہ** : (احرام کی حالت میں) نہ تو اپنا منہ ڈھانپے اور نہ سر ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مرد کو منہ کا ڈھانپنا جائز ہے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ مرد کا احرام اس کے سر میں اور عورت کا اس کے چہرے میں ہوتا ہے ۔

ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ ﷺ نے وفات پانے والے محرم شخص کے بارے میں فرمایا کہ اس کا منہ اور سر (کفن سے) نہ ڈھانپیں ۔ کیونکہ یہ شخص حشر کے دن تلبیہات کہتا ہوا اٹھے گا ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ (احرام میں) عورت اپنا چہرہ نہیں ڈھانپتی حالیکہ اس کے چہرہ کو نہ ڈھانپنے میں فتنے کا امکان بھی ہے تو مرد کے لیے بطریق اولی چہرہ ڈھانپنا مناسب نہ ہوگا ۔

امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت میں (احرام کے سلسلے میں مرد اور عورت کے) سر ڈھانپنے کے فرق کو بیان کیا گیا ہے (کہ مرد کے لیے کشف الرأس ضروری ہے اور عورت کے لیے ضروری نہیں تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ عورت سر ڈھانپ سکتی ہے کیونکہ احرام اس کے چہرے پر اثر انداز ہوتا ہے) ۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ محرم کوئی

خوشبو استعمال نہ کرے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ۔ کہ حج کرنے والا شخص پراگندہ بالوں والا اور میلا کچیلا ہوتا ہے ۔ اسی روایت کی بناء پر بالوں میں تیل ڈالنا بھی روا نہیں (حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں بندے کو اپنے خالق کے حضور میں مجنون بنا کر دکھایا گیا ہے کہ وارفتہ عاشق کی طرح اسے لباس اور اپنے جسم کی نظافت و صفائی کا کچھ ہوش نہیں رہتا ، بس در محبوب کا طواف کرنا ہی اس کا مقصد اعلی ہوتا ہے ۔ یہی حالت ایک محرم کی بھی ہوتی ہے) ۔

مسئلہ : محرم نہ تو سر منڈائے اور نہ بدن کے بال ، اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "ولَا تَحلِقُوا رءُوسَكُمْ" ۔

مسئلہ : اپنی داڑھی کے بال بھی نہ کاٹے کیونکہ بالوں کا کٹنا بھی معنوی لحاظ سے مونڈنے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ نیز بالوں کے کاٹنے میں ان کی پراگندگی اور میل کچیل کا ازالہ نیز ان کی زیب و زینت لازم آتی ہے ، (حالیکہ یہ امور محرم کے لیے روا نہیں ہیں) ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ ورس ، زعفران اور عصفر سے رنگ کیا ہوا کپڑا نہ پہنا جائے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ محرم وہ کپڑا نہ پہنے جس کے رنگنے میں زعفران یا ورس استعمال کیا گیا ہو ۔ ورس اور عصفر بھی زعفران کی طرح خوشبودار نباتاتی

اشیاء ہیں) ۔ البتہ اگر (مذکورہ اشیاء میں رنگا ہوا کپڑا) اس طرح دھو دیا جائے کہ اس سے خوشبو نہ آئے تو اس کا استعمال جائز ہے کیونکہ ممنوع تو خوشبو ہے نہ کہ رنگ ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عصفر سے رنگا ہوا کپڑا پہننے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ عصفر کا رنگ تو ہوتا ہے مگر خوشبو نہیں ہوتی ۔ علماء احناف کا کہنا ہے کہ عصفر کی اچھی بھلی خوشبو ہوتی ہے ۔

**مسئلہ** : محرم کے غسل کرنے اور حمام میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے احرام کی حالت میں غسل فرمایا تھا ۔

اسی طرح گھر میں داخل ہو کر سائے میں بیٹھنے یا کجاوے کے سائے میں آنے (مثلاً کجاوے پر چھاتا تان لینے) سے کوئی مضایقہ نہیں ۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خیمے یا اس کے مشابہ چیز کے سائے میں جانا مکروہ ہے ۔ کیونکہ اس میں سر ڈھانپنے سے مشابہت لازم آتی ہے ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ احرام باندھے ہوتے تھے اور ان کے لیے خیمہ نصب کیا جاتا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ خیمے کے ساتھ انسان کا بدن تو مس نہیں کرتا اس لیے خیمہ بھی گھر کی مانند ہوگا ۔

مسئلہ : اگر کعبہ کے پردوں تلے اس طرح داخل ہوا کہ اس کا بدن چھپ گیا سر اور چہرہ پردے سے باہر رہا تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ صورت بھی سائے میں بیٹھنے کی طرح ہوگی .

مسئلہ : کمر سے تھیلی باندھنے میں کوئی قباحت نہیں . امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب تھیلی میں دوسرے آدمی کا روپیہ ہو تو مکروہ ہے کیونکہ اس صورت میں اسے کوئی مجبوری نہ تھی (کہ سلی ہوئی چیز استعمال کرتا) .

ہم کہتے ہیں کہ تھیلی کا کمر سے باندھنا سلے ہوئے کپڑے کے پہننے کی طرح نہیں ہوتا . اس لیے دونوں صورتیں برابر ہوں گی (کہ اپنا روپیہ پیسہ ہو یا دوسرے کا) .

مسئلہ : گل خطمی سے سر اور داڑھی نہ دھوئے کیونکہ یہ خوشبو کی ایک قسم ہے . نیز اس سے جوئیں بھی مر جاتی ہیں (اور محرم کے لیے دونوں باتیں جائز نہیں) .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ ہر نماز کے بعد کثرت سے تلبیہات کہے، نیز جب کبھی بلند مقام پر چڑھے یا وادی میں اترے یا سواروں سے سامنا ہو تو تلبیہ کہے اور خصوصاً سحر کے وقت کثرت سے

کہے کیونکہ آپ ﷺ کے صحابہؓ ان مذکورہ تمام احوال میں (کثرت سے) تلبیہات کہا کرتے تھے۔

حالت احرام میں تلبیہ کی وہی حیثیت ہے جو حالت نماز میں تکبیر کی ہے۔ اور جس طرح نماز میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کرتے ہوئے تکبیر کہی جاتی ہے (اسی طرح حالت احرام میں بھی مذکورہ احوال کے مختلف ہونے پر تلبیہات کہی جائیں گی)۔ تلبیہ بلند آواز سے کہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"أَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ" عج کے معنی یہ ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ تلبیہات کہی جائیں۔ اور ثج کے معنی ہیں خون بہانا: (یعنی قربانی دینا)۔

مسئلہ: محرم جب مکہ مکرمہ میں داخل ہو تو مسجد سے ابتداء کرے جیسا آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ جونہی آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تو سیدھے مسجد میں تشریف لے جاتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل مقصد تو زیارت بیت اللہ ہے اور بیت اللہ مسجد ہی میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں آنے کا مطلب شہر میں داخل ہونا ہے اور شہر میں داخلہ کسی وقت معین کے ساتھ مخصوص نہ ہوگا۔ (نسائی میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ حج کے موقع

ہر دن کے وقت مکہ میں داخل ہوئے تھے اور عمرہ کے موقع پر رات کو تشریف لائے تھے . اس روایت سے تخصیص وقت کا شبہ پڑتا تھا . صاحب ہدایہ نے اس کا ازالہ کر دیا کہ نبی اکرم ﷺ کا مختلف اوقات میں آنا اتفاق تھا . اس سے تخصیص وقت مراد نہیں . ہاں مناسب یہ ہے کہ دن کے وقت شہر میں داخل ہو تا کہ رات سے پہلے کسی مناسب قیام گاہ کا انتخاب کر کے اپنا سامان جا سکے اور رات کے وقت آنے میں کئی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے . ابن عمرؓ سے بھی ایسے ہی منقول ہے) .

مسئلہ : (شہر میں داخل ہونے کے بعد) جب بیت اللہ پر نظر پڑے تو تکبیر و تہلیل کہے . حضرت ابن عمرؓ جب بیت اللہ کو دیکھتے تو بِسْمِ اللّٰہِ و اللّٰہُ اکبر کہا کرتے تھے .

امام محمدؒ نے مبسوط میں مقامات حج کے لیے کوئی خاص دعائیں متعین نہیں کیں کیونکہ اگر چند مخصوص دعائیں ہی معین کر دی جائیں تو رقت قلبی کی کیفیت ضرور متأثر ہوتی ہے . (اس لیے کہ پہلی بار بیت اللہ کو دیکھ کر سر کش سے سر کش انسان کا دل بھی عظمتِ الٰہی کی وجہ سے پگھل جاتا ہے اور انسان کے جذبات میں ایک تلاطم بپا ہو جاتا ہے ایسے میں جو الفاظ بے تکلفی سے

انسان کے منہ سے نکلتے ہیں وہ صدق و اخلاص کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گے . اگر ایسے موقع پر چند الفاظ مخصوص و معین کر دیے جائیں تو جذبات کا یہ بہاؤ فوری طور پر رک جائے گا). ہاں اگر منقول دعائیں بطور تبرک پڑھنا چاہے تو بڑی اچھی بات ہے . (مثلاً سعید بن مسیبؒ نے حضرت عمر فاروقؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ خانہ کعبہ کو دیکھنے پر یہ دعاء پڑھتے تھے : **اللهم انت السلام ومنك السلام فحينا ربنا بالسلام .**

امام شافعیؒ نے ابن جُرَیج کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کو دیکھ کر یہ دعا پڑھی : **اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيفاً وَتَعْظِيماً وَتَكْرِيماً وَمَهَابَةً وَزِدْ مِنْ شَرَفِهِ وَكَرَمِهِ مِمَّنْ حَجَّهُ أَوِ اعْتَمَرَهُ تَشْرِيفاً وَتَعْظِيماً وَتَكْرِيماً .**

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ پھر حجر اسود سے شروع کرے ، اس کی طرف متوجہ ہو اور تکبیر و تہلیل کہے ، جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو حجر اسود سے ابتداء فرمائی اس کی طرف رخ کیا اور تکبیر و تہلیل کہی .

**مسئلہ** : اپنے دونوں ہاتھ (کندھوں کے برابر) اٹھائے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ سات مواقع

کے سوا ہاتھ نہ اٹھائے جائیں من جملہ ان مواقع کے آپ ﷺ نے استلام حجر کا تذکرہ بھی فرمایا ۔

مسئلہ : اگر کسی مسلمان کو ایذاء دیے بغیر ممکن ہو کہ حجر اسود کو چھو سکے یا بوسہ دے سکے تو ضرور ایسا کرے ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر اپنے مقدس ہونٹ رکھے ۔ یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے عمر فاروق رض سے فرمایا : اے عمر ! آپ طاقت ور اور قوی انسان ہیں آپ سے ضعیف اور کمزور آدمی کو تکلیف پہنچ سکتی ہے اس لیے ازدحام کو چیر کر حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش نہ کریں ۔ ہاں اگر (آسانی سے) راستہ مل سکے تو بوسہ دیا کریں ، ورنہ اس طرف رخ کرکے تکبیر و تہلیل کہ لیا کریں ۔

دوسری بات یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے مگر مسلمان کی ایذاء دہی سے احتراز کرنا واجب ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری رح فرماتے ہیں ۔ اگر ممکن ہو کہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز مثلاً شاخ یا چھڑی وغیرہ سے حجر اسود کو چھو کر اسے بوسہ دے سکے تو ایسا ہی کرلے ۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ سے مروی

ہے کہ آپ ﷺ نے سواری پر بیٹھ کر طواف کیا اور
حجر اسود اور رکن یمانی کو اپنی چھڑی سے چھوکر
چھڑی کو بوسہ دیا ۔ اگر اس طرح بھی نہ کر سکے
تو حجر اسود کی جانب رخ کرے اور تکبیر و تہلیل
کہے ۔ اللہ تعالی کی حمد و ثناء کرے اور نبی کریم ﷺ
پر درود پڑھے ۔ پھر اپنے دائیں (ہاتھ) سے باب الکعبۃ
کی جانب سے بیت اللہ کا طواف شروع کرے اور
سات چکر لگائے ۔ در آنحالیکہ چادر کا اضطباع کیے ہوئے
ہو جیسا کہ امام مسلم نے نبی اکرم ﷺ سے روایت
کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا ۔
پھر اپنے دائیں (ہاتھ) سے باب الکعبۃ کی جانب سے
سات بار بیت اللہ کا طواف کیا ۔

اضطباع یہ ہے کہ (اوپر والی) چادر کو اپنی
دائیں بغل کے نیچے سے گزارے اور بائیں کندھے پر
ڈال دے (اس طرح دایاں کندھا ننگا رہے گا اور بائیں
کے اوپر چادر ہوگی)، یہ سنت ہے ۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ
سے اسی طرح منقول ہے ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ حطیم کے
باہر کی جانب سے طواف کرے (یعنی طواف میں چکر
اس طرح لگائے کہ حطیم بھی طواف میں داخل ہوجائے) ۔

حطیم اس جگہ کا نام ہے جس میں میزاب الرحمۃ

ہے ۔ حطیم کو اس لیے حطیم کہا جاتا ہے کہ اسے بیت اللہ سے توڑ لیا گیا تھا یعنی اس جگہ کو بیت اللہ سے الگ کر لیا گیا تھا ۔ حطم کے معنی کسر یعنی توڑنا ہیں ۔ (اصل واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل سیلاب سے خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو قریش نے کعبہ کی عمارت کو پھر سے تعمیر کرنا چاہا ۔ چنانچہ انہوں نے کام شروع کر دیا لیکن کچھ حصہ تعمیر کرنے کے بعد اخراجات میں کمی واقع ہو گئی ۔ لہذا قریش نے حطیم والا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ مکمل کر دیا ۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا ۔ اے عائشہؓ ! اگر تیری قوم حدیث الاسلام نہ ہوتی تو میں پھر حطیم کو بیت اللہ میں شامل کرکے از سر نو تعمیر کراتا) ۔

(حطیم کے علاوہ) اس جگہ کو حجر بھی کہا جاتا ہے ۔ حجر کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں اور اس جگہ کو بھی بیت اللہ میں شامل کرنے سے روک دیا گیا تھا ۔ حالیکہ یہ جگہ بیت اللہ میں شامل تھی جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث عائشہؓ میں مذکور ہے کہ حطیم کے باہر کی طرف سے طواف کیا جاتا ہے ۔ حتی کہ اگر کوئی شخص بیت اللہ اور حطیم کی درمیانی کھلی جگہ سے طواف کرے تو جائز نہ ہوگا ۔ (بلکہ طواف کا اعادہ واجب ہوگا) ۔

(سوال . اگر حطیم بیت اللہ کا حصہ ہے تو کیا صرف حطیم کی طرف منہ کرکے نماز ادا کی جا سکتی ہے؟ صاحب ھدایہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) اگر صرف حطیم کی طرف رخ کرکے نماز ادا کی جائے تو جائز نہ ہوگی . کیونکہ استقبال قبلہ کی فرضیت کا ثبوت نص کتاب سے ملتا ہے یعنی : [فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَه] . اس لیے احتیاط کے پیش نظر اس چیز سے جو خبر واحد سے ثابت ہوئی ہے ادائیگی درست نہ ہوگی (یعنی مذکورہ حدیث کہ حطیم بیت اللہ کا حصہ ہے خبر واحد ہے اور خبر واحد سے اس طرح فرضیة ثابت نہیں ہو سکتی جس طرح کہ نص الکتاب سے ہوتی ہے . اس لیے خبر واحد کی بناء پر صرف حطیم کی طرف منہ کرکے نماز کی ادائیگی درست نہ ہوگی) . لیکن طواف میں محتاط صورت یہ ہے کہ حطیم کے باہر سے کیا جائے (تاکہ حطیم اگر واقعی بیت اللہ کا حصہ ہو تو طواف نامکمل نہ رہے) .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کرے رمل یہ ہے کہ طواف کے لیے چلتے ہوئے اپنے دونوں کندھوں کو خوب حرکت دے کر چلے جس طرح کہ ایک مبارز (جنگجو) مقابلے کے لیے صفوں کے درمیان خوب تن تن کر چلتا

ہے اس دوران میں چادر اضطباع کی صورت میں لپیٹی ہوئی ہو۔

رمل کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ اس طرح کی چال ڈھال سے مشرکین پر ظاہر کرنا تھا کہ مسلمان قوت و ہمت کے لحاظ سے عروج پر ہیں. مشرکین نے صحابہ کرام کو دیکھ کر کہا تھا کہ دیکھو ان بے چاروں کو یثرب (مدینہ منورہ) کی گرمی اور بخار نے نڈھال کر دیا ہے. (جب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رض طواف کرنے لگے تھے تو مشرکین ادھر ادھر بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے. اس لیے نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف کرتے ہوئے جب مشرکین کے سامنے سے گزرو تو خوب تن کر اور مٹک مٹک کر چلو تاکہ مشرکین کو یہ وہم نہ رہے کہ ہم مدینہ جا کر کمزور ہوگئے ہیں). اس سبب کے ختم ہونے کے بعد بھی دور نبوی میں رمل کا حکم باقی رہا بلکہ دور نبوی کے بعد بھی ہمیشہ کے لیے سنت بن گیا (اللہ تعالی کو نبی اکرم اور صحابہ کرام رض کی یہ ادا ایسی بھائی کہ اسے قیامت تک باقی رکھا).

امام قدوری رح فرماتے ہیں کہ باقی چکروں میں اپنی عادت کے مطابق چلے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے حالات حج بیان کرنے والے راویوں (مثلاً حضرت عمر رض اور حضرت جابر رض) کا اسی بات پر اتفاق ہے.

رمل حجر اسود سے حجر اسود تک ہوگا کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے اسی طرح منقول ہے . [اس جملے سے صاحب ھدایہ ایک شبہ دور کرنا چاہتے ہیں کہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کعبہ کی تین اطراف سے مشرکین کو نظر آ رہے تھے اور رمل کا مقصد چونکہ مشرکین کے سامنے اظہار قوت تھا . اس لیے شاید چوتھی جانب میں ، جو کہ مشرکین سے اوجھل تھی ، رمل ضروری نہ ہو . تو صاحب ھدایہ اس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رمل حجر سے شروع کرکے حجر تک ہی ختم کرے . یعنی کعبہ کی چاروں طرف رمل کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا] .

مسئلہ : اگر رمل کرتے وقت (ازدحام بہت زیادہ ہو جائے اور) لوگ مزاحمت کرنے لگیں تو کھڑا ہو جائے اور جب راستہ صاف ہو جائے تو رمل کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ رمل (نہ کرنے کی صورت میں اس) کا کوئی بدل نہیں اس لیے (بھیڑ زیادہ ہونے پر) ٹھیر جائے (اور بھیڑ چھٹ جانے کا انتظار کرے) تاکہ مسنون طریقے پر رمل کر سکے، بخلاف حجر اسود کے بوسہ دینے کے (اگر بھیڑ ہو تو بوسہ دینے کے لیے انتظار نہ کرے) کیونکہ حجر اسود کی طرف رخ کرنا ہی استلام کا بدل ہے .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو ہر بار حجر اسود کے پاس سے گزرتے ہوئے بوسہ دے کیونکہ طواف کے چکر نماز کی رکعات کی طرح ہیں . تو جس طرح نماز کی ہر رکعت کو تکبیر سے شروع کیا جاتا ہے اسی طرح طواف کا ہر چکر استلام حجر سے شروع کیا جائے گا .

اگر بوسہ دینا یا چھونا ممکن نہ ہو تو اس کی طرف منہ کر کے تکبیر و تہلیل کہے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اور رکن یمانی کو بھی بوسہ دے (یا چھوئے) . ظاہر الراویۃ کے مطابق استلام رکن یمانی مستحب اور حسن ہے . امام محمدؒ سے اس کا سنت ہونا مذکور ہے .

مسئلہ : حجر اسود اور رکن یمانی کے علاوہ کسی چیز کو بوسہ نہ دے کیونکہ نبی اکرم ﷺ صرف انھی دو رکنوں کو بوسہ دیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ کسی (دوسرے رکن مثلاً رکن عراق یا رکن شامی) کو نہیں . طواف کا اختتام بھی استلام حجر پر کرے (جس طرح کہ ابتداء استلام سے کی جاتی ہے) .

مسئلہ : پھر (طواف مکمل کرنے کے بعد) مقام ابراھیمؑ کے پاس آئے اور دو رکعت نماز ادا کرے یا (اگر مقام ابراہیمؑ کے پاس جگہ نہ مل سکے تو) مسجد میں جہاں بھی جگہ مل جائے (دو رکعت ادا کرے) .

یہ دو رکعت ہمارے نزدیک واجب ہیں ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سنت ہیں کیونکہ ان کے وجوب کی کوئی دلیل نہیں ۔

ہماری دلیل نبی علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے کہ طواف کرنے والا ہر سات چکروں کے بعد دو رکعت ادا کرے ۔ اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے ۔

پھر حجر اسود کی طرف آئے اور استلام کرے ۔ جیسا کہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب دو رکعت ادا فرما لیں تو حجر اسود کی طرف تشریف لائے ۔ اس بارے میں یہ امر اصل اور قانون کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہر وہ طواف جس کے بعد سعی ہو (طواف اور دو رکعت کے اختتام پر) حجر اسود کے پاس آئے کیونکہ جس طرح طواف کی ابتداء استلام حجر سے ہوتی ہے اسی طرح سعی کا افتتاح بھی استلام حجر سے ہونا چاہیے ۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب طواف کے بعد سعی نہ ہو (تو پھر آخر میں استلام حجر بھی ضروری نہیں) ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ یہ طواف طواف قدوم کہلاتا ہے اور اسے طواف تحیہ کا نام دیا جاتا ہے ۔ یہ طواف سنت ہے واجب نہیں ہے ۔ امام مالکؒ وجوب کے قائل ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ

کا ارشاد ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں آئے وہ طواف کا تحفہ پیش کرے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے طواف کرنے کا حکم دیا ہے : (وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ) : اور امر مطلق میں تکرار کا تقاضا نہیں ہوتا۔ اور اجتماعی طور پر اس طواف سے مراد طواف زیارت ہے (لہذا طواف زیارت کے علاوہ اور کوئی واجب نہ ہوگا)۔ امام مالک کی پیش کردہ حدیث میں بھی طواف کو تحیہ اور تحفہ کہا گیا ہے اور یہ استحباب کی دلیل ہے۔

اہل مکہ کے لیے طواف قدوم لازم نہیں کیونکہ ان کے حق میں جب قدوم (باہر سے آنا) ہی متحقق نہیں ہوتا تو طواف قدوم کیسے ہوگا ؟

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ پھر کوہ صفا کی طرف نکلے اور اس پر چڑھ کر بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوکر تکبیر و تہلیل کہے۔ نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھے اور ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالی سے اپنی حاجت کے لیے التماس کرے۔ جیسا کہ روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کوہ صفا پر تشریف لے گئے حتی کہ جب بیت اللہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوگئے اور اللہ تعالی سے دعاء کرنے لگے۔

حمد و ثناء اور درود کو دعاء سے مقدم کرے کیونکہ اگر ثناء و صلاۃ دعاء سے مقدم ہوں تو دعاء اجابت کے بہت قریب ہوتی ہے ۔ جیسا کہ دوسری دعاؤں میں (بھی ثناء و صلاۃ دعاء سے مقدم ہوتی ہیں ۔ تشھد میں بھی پہلے حمد ہے پھر درود ہے اور آخر میں دعاء ہے).

(دعاء میں) ہاتھ اٹھانا دعاء کی سنت ہے) ۔

کوہ صفا پر اس قدر بلندی تک چڑھے کہ بیت اللہ نظروں کے سامنے آجائے کیونکہ صفا پر چڑھنے کا مقصد ہی استقبال کعبہ ہے ۔

جس دروازے سے چاہے نکل کر صفا کی طرف جائے نبی اکرم ﷺ باب بنی مخزوم۔جسے باب الصفا بھی کہا جاتا ہے۔نکلے تھے کیونکہ صفا پر جانے کے لیے یہ دروازہ سب سے قریب تھا ۔ نہ یہ کہ اس دروازے سے جانا سنت تھا ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ پھر مروہ کی طرف جانے کے لیے (صفا سے) اترے اور باوقار طریقے سے چلنا شروع کرے اور جب وادی کے وسط میں پہنچے تو میلین اخضرین کے درمیان دوڑ لگائے اور اس کے بعد اپنی عادت کے مطابق چلنا شروع کرے حتی کہ مروہ تک پہنچ کر چڑھنا شروع کرے اور جو کچھ صفا پر کیا تھا مروہ پر بھی کرے (یعنی استقبال

قبلہ ، حمد و ثناء ، درود و سلام اور دعاء) جیسا کہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ کوہ صفا سے نیچے اترے اور مروہ کی طرف چل پڑے . وسط وادی سے دوڑ کر گزرے اور وادی سے نکل کر پھر چلنا شروع کیا حتی کہ مروہ پر تشریف لے گئے .

صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے . یہ (ایک دفعہ صفا سے مروہ تک جانا) ایک چکر ہوگا . اسی طرح سات چکر پورے کرے . ہر چکر صفا سے شروع کرے اور مروہ پر ختم کرے اور ہر چکر میں وسط وادی سے دوڑ کر گزرے جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں .

چکر کا آغاز صفا سے کرے . آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم بھی وہیں سے ابتداء کرو جہاں سے اللہ تعالی نے ابتداء فرمائی ہے: (اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ) .

صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب ہے . رکن اور فرض نہیں .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سعی رکن ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالی نے تم پر سعی فرض کی ہے پس سعی کو سر انجام دو .

ہماری دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے : "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ

**اَنْ یطَّوَّفَ بِهِمَا**" اور اس قسم کے الفاظ (یعنی لا جناح وغیرہ) اباحۃ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں پس رکنیۃ اور فرضیۃ کا احتمال جاتا رہا . البتہ ہم نے آیۃ کے مقتضی کے تحت ایجاب کی طرف رجوع کیا (یعنی مذکورہ آیۃ کا مقتضی تو یہ تھا کہ اس سے وجوب بھی ثابت نہ ہو مگر ہم نے ضرورت کے تحت مقتضی یعنی عدم فرضیۃ سے رجوع کرکے وجوب کو باقی رکھا) .

دوسری دلیل یہ ہے کہ فرضیۃ دلیل قطعی سے ثابت ہوا کرتی ہے مگر مذکورہ مسئلے میں دلیل قطعی موجود نہیں . امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت میں کتب سے فرضیۃ ثابت نہیں ہوتی بلکہ استحباب مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالی کے اس ارشاد ــ **کُتِبَ عَلَیْکُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُکُمُ الْمَوْتُ الآیۃ** ــ میں **کُتِبَ** سے استحباب کا پتا چلتا ہے .

پھر مکہ مکرمہ میں حالت احرام ہی میں قیام کرے کیونکہ اس نے حج کے لیے احرام باندھا ہوا ہے اس لیے جب تک افعال حج کی تکمیل نہ کرلے احرام سے نہیں نکلے گا .

(مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران) جب بھی موقع ملے طواف سے فیض یاب ہوتا رہے کیونکہ خانہ کعبہ کا طواف نماز کا درجہ رکھتا ہے . نبی اکرم ﷺ کا

ارشاد ہے کہ کعبہ کا طواف کرنا نماز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور نماز بہترین موضوع ہے، اسی طرح طواف بھی (بہترین موضوع ہوگا). البتہ اس عرصے میں ان طوافوں کے بعد سعی (بین الصفا والمروۃ) نہیں ہوگی. کیونکہ سعی صرف ایک مرتبہ واجب ہے اور نفلی طور پر سعی مشروع نہیں.

ہر سات چکروں کے بعد دو رکعتیں نفل ادا کرے اور یہ طواف کی رکعتیں کہلاتی ہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں.

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ یوم الترویہ سے ایک دن پہلے امیرالحج ایک خطبہ دے جس میں لوگوں کو منٰی کی طرف جانے، عرفات میں نماز پڑھنے، وقوف کرنے اور (عرفات سے) لوٹ کر مزدلفہ آنے کے احکام سے آگاہ کرے [یوم الترویہ آٹھ ذی‌الحجۃ کا دن ہوتا ہے چنانچہ یہ خطبہ سات ذی‌الحجۃ کو دیا جائے گا]. الحاصل حج میں تین خطبے ہیں. پہلا تو وہی ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے. دوسرا خطبہ عرفات میں یوم عرفہ (۹ ذی‌الحجۃ) کو اور تیسرا منی میں گیارہ ذی‌الحجۃ کو. ہر خطبے کے درمیان ایک ایک دن کا وقفہ ہوگا (پہلا سات کو دوسرا نو کو اور تیسرا گیارہ کو ہوگا. پہلا اور تیسرا ایک ہی خطبہ ہوتا ہے یعنی عام خطبوں کی طرح درمیان میں جلوس نہیں ہوتا نیز

دونوں خطبے نماز ظہر کے بعد ہوتے ہیں ۔ یوم عرفہ والا خطبہ عام خطبوں کی طرح دوحصوں میں ہوتا ہے اور درمیان میں جلوس بھی ہوتا ہے نیز یہ صلاۃ ظہر سے پہلے ہوتا ہے] ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ تینوں خطبے متواتر ہوں گے (یعنی درمیان میں ایک ایک دن کا وقفہ نہ ہوگا) پہلا خطبہ یوم الترویہ (یعنی آٹھ تاریخ) کو ہوگا دوسرا نو اور تیسرا دس ذی‌الحجۃ کو) ۔

کیونکہ یہی مذکورہ ایام موسم حج کے پر رونق اور حجاج کے جمع ہونے کے لیے صحیح مواقع مہیا کرتے ہیں ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ خطبات کا اصل مقصد تولوگوں کو (تفصیلات حج وغیرہ کی) تعلیم دینا ہے ۔ مگر یوم ترویہ اور یوم نحر مصروف ترین دن ہوتے ہیں (لہذا ان ایام میں لوگوں کی توجہ دوسرے ضروری مشاغل سے ہٹا کر خطبات کی طرف مبذول کرانا مناسب نہیں) ۔ اس لیے خطبات کا وہ طریق جو ہم نے ذکر کیا ہے (یعنی متبادل ایام میں خطبے دینا) زیادہ مفید اور مؤثر ہوگا ۔

**مسئلہ** : یوم ترویہ کو مکہ مکرمہ میں فجر کی نماز پڑھ کر منی کی طرف نکلے ۔ اور منی میں یوم عرفہ کی نماز فجر پڑھنے تک قیام کرے جیسا کہ آنحضرت ﷺ

سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے یوم ترویہ کو فجر کی نماز مکہ مکرمہ میں ادا فرمائی اور طلوع آفتاب کے بعد منی کی طرف روانہ ہو گئے . وہاں آپ نے ظہر ، عصر ، مغرب ، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا فرمائیں پھر عرفات کی طرف تشریف لے گئے .

اگر کوئی حاجی عرفہ کی رات مکہ مکرمہ میں گذارے اور فجر کی نماز وهیں ادا کر کے عرفات کی طرف روانہ ہو جائے اور راستے میں منی سے اس کا گزر ہوا تو جائز ہوگا . کیونکہ اس دن منی میں کسی نُسک کی ادائیگی کے متعلق کوئی حکم نہیں ہے . البتہ نبی ﷺ کی سنت کی اقتدا نہ کرنے میں قباحت ضرور ہے .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ پھر عرفات کی طرف رواں ہو جائے اور وہاں قیام کرے . جیسا کہ ہم روایت کر آئے ہیں . یہ (یعنی طلوع شمس کے بعد عرفات کی طرف روانہ ہونا) افضل صورت کا بیان ہے . ورنہ اگر طلوع شمس سے پہلے بھی روانہ ہو جائے تو کوئی مضایقہ نہیں کیونکہ اس دن منی میں کسی نسک کی ادائیگی کے متعلق کوئی حکم وارد نہیں (اس لیے طلوع آفتاب سے پہلے بھی جانا جائز ہوگا) .

امام محمدؒ مبسوط میں فرماتے ہیں کہ میدان عرفات میں لوگوں کے ساتھ ہی اترے (اس فقرے کے تین مطلب ہیں) :

۱۔ یعنی لوگوں سے الگ نہ رہے بلکہ ان کی معیت میں ہو ، کیونکہ دوسرے حجاج سے الگ اور کٹ کر رہنے میں فخر و تکبر کا شائبہ ہے حالیکہ یہ موقع تضرع، عاجزی اور فروتنی کا ہے . (مشرکین مکہ حج کے دوران میدان عرفات میں لوگوں سے الگ ڈیرے لگاتے تاکہ امتیاز قائم رہے . اسلام نے اس قسم کی علیحدگی سے منع فرمایا ہے) .

۲۔ جماعت کے ساتھ قبولیت دعاء کی زیادہ توقع ہوتی ہے (ممکن ہے کہ لوگوں میں کوئی مستجاب الدعوات ہستی ہو جس کی وجہ سے سب کی دعاء مقبول ہو جائے . جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے :

شنیدم کہ روز امیدست و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم)

۳۔ بعض نے امام محمدؒ کے قول کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ عرفات میں راستے پر اتر کر ڈیرہ نہ لگائے تاکہ گزرنے والوں کو دقت کا سامنا نہ ہو ، (بلکہ راستے سے ہٹ کر لوگوں کے ساتھ ایک طرف ڈیرہ جمائے تاکہ کسی آنے جانے والے کے لیے رکاوٹ نہ ہو) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ (میدان عرفات میں) جب سورج ڈھل جائے تو امام لوگوں کو

ظہر اور عصر کی نماز پڑھائے . امام خطبے سے ابتداء کرے (یہاں فاء تعقیب کے لیے نہیں کہ پہلے نماز ہو اور بعد میں خطبہ ہو بلکہ فاء تفصیل کے لیے ہے . خطبہ پہلے اور نماز بعد میں ہوگی) اور خطبے میں حجاج کو وقوف عرفہ ومزدلفہ ، رمی الجمار ، قربانی ، سرمنڈانے اور طواف زیارت وغیرہ کے احکام و تفاصیل سے آگاہ کرے .

امام جمعہ کی طرح دو خطبے دے اور درمیان میں جلسہ بھی کرے. نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح کیا تھا .

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خطبہ نماز کے بعد دے کیونکہ یہ خطبہ پند و نصائح پر مشتمل ہوتا ہے . اس لیے عید کے خطبے کے مشابہ ہوگا . ہماری دلیل مذکورہ حدیث ہے . نیز خطبے کا مقصد مناسک حج اور جمع بین الصلاتین کے مسائل کی تعلیم دینا ہے (اور نماز کے بارے میں مسائل کا بتانا اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے ہو) .

ظاہری مذہب کے مطابق جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو مؤذن اذان کہے جیسا کہ جمعہ میں ہوتا ہے . امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ امام کے نکلنے سے پہلے اذان کہی جائے . ان سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ خطبہ کے بعد اذان کہی جائے .

مگر صحیح صورت وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے (کہ جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو اذان کہی جائے) ، کیونکہ نبی اکرم ﷺ جب نکلے اور اونٹنی پر سیدھے بیٹھ گئے تو مؤذنوں نے آپ کے سامنے اذان کہی . خطبے سے فراغت کے بعد مؤذن اقامت کہے کیونکہ خطبہ سے فراغت کے بعد نماز شروع کرنے کا وقت ہوتا ہے اس لیے نماز جمعہ کے مشابہ ہوگی .

مسئلہ : امام قدوری؄ فرماتے ہیں کہ امام الحج لوگوں کو ظہر کے وقت میں ظہر اور عصر کی نماز پڑھائے . دونوں نمازوں کے لیے اذان تو ایک ہوگی مگر اقامتیں دو ہوں گی . جمع بین الصلاتین کے متعلق مشہور احادیث منقول ہیں اور تمام راویان حدیث کا اتفاق ہے . صحیح مسلم میں حضرت جابر؄ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کیں . اس کی تفصیل یوں ہے کہ ظہر کی نماز کے لیے اذان کہی جائے ، پھر ظہر کے لیے اقامت ہوگی ، پھر عصر کے لیے اقامت ہوگی . کیونکہ عصر وقت مقرر سے قبل ادا کی جا رہی ہے اس لیے اقامت کہہ کر لوگوں کو اس پر متنبہ کیا جائے گا (کہ اب نماز ظہر ختم ہو چکی ہے اور نماز عصر شروع کی جاتی ہے) .

مسئلہ: دونوں نمازوں کے درمیان نفل نہ پڑھے جائیں

کیونکہ (دونوں نمازوں کے جمع کرنے کا) اصل مقصد تو عرفات میں وقوف ہے۔ اسی بناء پر عصر کو وقت سے مقدم کیا جاتا ہے (کہ عرفات میں کھڑا ہونے کا مناسب وقت مل سکے۔ اگر نفل شروع کر دیے جائیں تو پھر نمازوں کو جمع کرنے اور وقت بچانے کا کیا فائدہ؟)۔ نفلوں کی ادائیگی مکروہ ہوگی اور ظاہر الروایة کے مطابق (نفل پڑھنے کی صورت میں) عصر کی نماز کے لیے اذان کا اعادہ بھی کیا جائے گا، کیونکہ نوافل یا کسی دوسرے عمل میں مصروف ہونے سے اذان کا عصر سے وہ اتصال باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا عصر کے لیے اذان کا اعادہ کیا جائے گا۔ امام محمدؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ اگر امام خطبہ کے بغیر ہی نماز پڑھا دے تو جائز ہوگی، کیونکہ یہ خطبہ فرض نہیں ہے۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ظہر کی نماز انفرادی طور پر اپنی قیامگاہ میں پڑھ لی وہ عصر بھی اپنے وقت میں پڑھے۔ یہ امام اعظمؒ کا مسلک ہے۔

صاحبینؒ کا ارشاد ہے کہ منفرد بھی دونوں کو جمع کرے۔ کیونکہ جمع کرنے کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ وقوف (عرفات) کے لیے کافی وقت میسر آ سکے۔ اور اس امتداد وقت کی ضرورت منفرد کو بھی ہوتی ہے۔ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ وقت نماز کی محافظت

کی فرضیت نصوص قرآنیہ سے عیاں ہے (جیسے إن الصلوة کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً اور حافظوا علی الصلوات) . اس لیے سوائے شرعی دلیل کے اس فریضۃ کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور (مذکورہ صورت میں دلیل شرعی) جمع بالجماعت مع الامام ہے . فضیلت جماعت کو حاصل کرنے کے لیے ہی عصر کو (اپنے وقت سے) مقدم کیا جاتا ہے ، کیونکہ جب حجاج عرفات میں ادھر ادھر منتشر ہو جاتے ہیں تو نماز عصر کے لیے انہیں اکٹھا ہونا دشوار ہوتا ہے (اس لیے جماعت کی محافظت کے پیش نظر عصر کو مقدم کر دیا گیا) .

صاحبین نے جمع کرنے کا جو مقصد (یعنی امتداد وقت) بیان کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں . کیونکہ وقوف اور نماز میں کوئی منافات نہیں (کیونکہ نماز کے ادا کرنے سے وقوف بھی حاصل ہوتا ہے لہذا وقوف اور صلاۃ میں کوئی منافات نہیں) .

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ امام کی موجودگی دونوں نمازوں میں شرط ہے .

امام زفر فرماتے ہیں کہ عصر کی نماز کے لیے امام کی موجودگی خصوصاً شرط ہے . کیونکہ عصر ہی تو اپنے وقت سے مقدم کی جاتی ہے .

احرام بالحج کے سلسلے میں بھی اسی طرح اختلاف

ہے (امام اعظمؒ کے نزدیک وہ دونوں نمازوں کے لیے شرط ہوگا۔ حتی کہ اگر غیر محرم نے امام کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی، پھر حج کا احرام باندھا اور نماز عصر پڑھی تو امام زفرؒ کے نزدیک جائز ہوگی اور امام اعظمؒ کے نزدیک نہیں)۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تقدیم عصر (درحقیقت تو) خلاف قیاس ہے۔ مگر اس کی مشروعیۃ مندرجہ ذیل شرائط پر موقوف ہے:

یعنی جب عصر ایسی ظہر کے بعد ادا کی جا رہی ہو جسے امام کے ساتھ جماعت میں بحالت احرام ادا کیا گیا ہو۔ لہذا تقدیم عصر ان شرائط پر موقوف ہوگی۔

ایک روایت کے مطابق زوال سے پہلے پہلے حج کا احرام باندھ لیا جائے تاکہ جمع بین الصلاتین سے احرام مقدم ہو۔ دوسری روایت کے پیش نظر (زوال سے قبل احرام ضروری نہیں بلکہ) نماز سے پہلے پہلے احرام باندھا جا سکتا ہے کیونکہ اصل مقصود تو نماز ہے۔

**مسئلہ**: پھر امام موقف کی طرف متوجہ ہو اور جبل الرحمۃ کے پاس ٹھیرے اور دوسرے لوگ بھی نماز سے فراغت کے بعد (وقوف میں) امام کی اتباع کریں گے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نماز کے بعد موقف کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ پہاڑ کو جبل الرحمۃ اور موقف کو موقف اعظم کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ وادیِ عُرَنہ کے سوا سارا میدان عرفات موقف ہے . کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ عرفات سارے کا سارا موقف ہے . البتہ وادیِ عُرَنہ میں قیام نہ کرو . اسی طرح مزدلفہ تمام کا تمام موقف ہے . البتہ وادیِ مُحَسِّر اس سے خارج ہے .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں : مناسب یہ ہے کہ امام عرفہ میں سوار ہو کر وقوف کرے . کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر وقوف فرمایا تھا .

اگر پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو بھی جائز ہے . مگر پہلی صورت روایت مذکورہ کی بناء پر افضل ہے . بہتر یہ ہے کہ قبلہ رو ہو کر وقوف کرے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح وقوف فرمایا تھا . نیز آپ کا ارشاد ہے کہ بہترین وقوف وہ ہے جس میں (انسان) قبلہ کی طرف متوجہ ہو .

**مسئلہ** : اللہ تعالی سے دعائیں مانگے اور لوگوں کو مناسک کی تعلیم دے جیسا کہ مروی ہے . کہ نبی اکرم ﷺ عرفہ کے دن اس مسکین کی طرح جو کسی سے کھانے کی درخواست کرتا ہے اپنے ہاتھوں کو (آگے) پھیلا کر دعائیں کیا کرتے تھے .

مسئلہ : جو جی چاہے اللہ تعالی سے التماس کرے ، اگرچہ بعض روایات میں مخصوص دعائیں بھی مذکور ہیں ۔ ہم نے اپنی کتاب "عُدَّةُ النَّاسِكِ فِي عِدَّةٍ مِنَ الْمَنَاسِكِ" میں بتوفیق الہی ان کی تفصیل درج کر دی ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ لوگوں کو امام کے قریب ہی کھڑا ہونا چاہیے ، کیونکہ امام دعائیں مانگتا ہے اور احکام حج کی تعلیم دیتا ہے ۔ لہذا اگر قریب ہوں گے تو اچھی طرح سن سکیں گے اور یاد کر سکیں گے ۔

مناسب یہ ہے ، کہ لوگ امام کے پیچھے کھڑے ہوں ۔ تاکہ امام قبلہ رُو ہو ۔ (اور تمام) لوگ بھی قبلہ رُخ ہو کر کھڑے ہو سکیں) ۔

یہ — امام کے پیچھے کھڑا ہونا — بیان افضلیۃ ہے ۔ ورنہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں عرفات سارے کا سارا موقف ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں : مستحب یہ ہے کہ وقوفِ عرفہ سے قبل غُسل کرے ۔ اور (میدان عرفات میں) دعاؤں میں خوب عجز و ابتہال سے کام لے ۔ یہ غسل سنت ہے واجب نہیں ۔ اگر صرف وضو پر

اکتفا کر لے تب بھی جائز ہے ۔ جیسا کہ جمعہ ، عیدین اور احرام کے وقت (مستحب ہے) ۔

رہا دعاؤں میں آہ و زاری کرنا تو نبی اکرم ﷺ نے اس موقف میں اپنی امت کے لیے بڑی عاجزی اور خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں ۔ اور آپ کی تمام دعائیں خون اور مظالم (کی معافی) کے علاوہ در اجابت تک پہنچ گئیں ۔

**مسئلہ :** وقوف کے دوران ساعت بساعت تلبیہ کہتا رہے ۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میدان عرفات میں وقوف کرتے ہی تلبیہ کہنا قطع کر دے ۔ کیونکہ زبان سے اجابت تو ارکان میں مشغول ہونے سے پہلے پہلے ہوتی ہے ، (جیسا کہ نماز میں تکبیر تحریمہ دوسرے ارکان میں مشغولیت سے مقدم ہوتی ہے) ۔

ہماری دلیل وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تلبیہات کہتے رہے حتی کہ جمرۃ العقبہ تک تشریف لے آئے ۔ نیز تلبیہ کو اس میں وہی حیثیت حاصل ہے جو تکبیر کو نماز میں ہے ۔ لہذا تلبیہ احرام کے آخری اوقات تک مشروع ہوگی (جس طرح تکبیر نماز کے آخر تک مشروع ہے) ۔

**مسئلہ :** امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جب سورج غروب ہو جائے تو امام اور لوگ بڑے وقار اور سکون

کے ساتھ (میدان عرفات سے) لوٹ آئیں ۔ حتی کہ مزدلفہ میں آ جائیں ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ غروب آفتاب کے بعد لوٹ آئے تھے ۔ نیز اس میں مشرکین کی مخالفت کا اظہار بھی ہے (کیونکہ وہ غروب آفتاب سے قبل لوٹا کرتے تھے) ۔

واپسی پر نبی اکرم ﷺ اپنی سواری پر تشریف فرما ہوتے اور بڑے پر وقار انداز سے مراجعت فرماتے ۔

اگر کوئی شخص ازدحام سے گھبرا جائے اور امام سے پہلے ہی روانہ ہو جائے مگر امام سے پہلے حدود عرفات سے تجاوز نہ کرے تو جائز ہوگا (اور اگر غروب آفتاب اور امام سے پہلے حدود عرفہ سے متجاوز ہو جائے تو اس پر دم واجب ہوگا) ۔

کیونکہ (مذکورہ صورت میں یعنی جب حدود عرفہ سے متجاوز نہ ہو) وہ (امام سے پہلے) عرفات سے واپس نہیں لوٹا ۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر ٹھیرا رہے (اور لوگوں کے ساتھ لوٹے) تا کہ وہ قبل از وقت ہی ادا کو شروع کرنے والا نہ ہو ۔ (ادا سے مراد اداء مراجعت ہے) ۔

اگر غروب آفتاب اور مراجعت امام کے بعد کچھ دیر ازدحام کے پیش نظر رک جائے تو کوئی حرج نہیں ۔ کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ

صدیقه رضی الله عنها نے امام کی مراجعت کے بعد پینے کی چیز منگوائی اور روزہ افطار کیا پھر مراجعت فرمائی .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جب مزدلفہ آئے تو مستحب یہ ہے کہ اس پہاڑ کے پاس کھڑا ہو جس پر مِیقَدہ ہے اور جسے قُزَح کہا جاتا ہے . (میقدہ بمعنی آگ جلانے کی جگہ . اسلام سے قبل مشرکین حج کے موقع پر اس جگہ آگ جلایا کرتے تھے) کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس پہاڑ کے قریب وقوف فرمایا تھا . اور حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا . اس پہاڑ کے پاس اترتے وقت یہ خیال رکھے کہ راستے سے احتراز کرے ورنہ آنے جانے والوں کو دقت پیش آئے گی . اس لیے راستے کے دائیں یا بائیں رُخ اترے .

مستحب یہ ہے کہ مزدلفہ میں وقوف کرتے وقت امام کے پیچھے کھڑا ہو جیسا کہ ہم وقوف عرفہ کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں (کہ اس طرح وہ قبلہ رو کھڑے ہو سکیں گے) .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ امام لوگوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ ادا کرے .

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ عرفات میں جمع بین الصلاتین کی طرح ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کی

جائیں گی . ہماری دلیل حضرت جابرؓ کی روایت ہے
کہ نبی اکرم ﷺ نے دونوں نمازوں کو ایک اذان
اور ایک اقامت سے جمع فرمایا .

۔ ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ عشاء کی نماز چونکہ
اپنے وقت میں ادا کی جارہی ہے اس لیے لوگوں کو
جتلانے کے لیے الگ اقامت کہنا ضروری نہیں (کیونکہ
وقت ہی عشاء کا ہے اس لیے لوگ خود بخود سمجھ لیں
گے کہ عشاء کی نماز ادا کی جا رہی ہے) .

بخلاف عرفہ میں عصر ادا کرنے کے کیونکہ وہاں
عصر کو اپنے معین وقت پر مقدم کیا جاتا ہے .
اس لیے اس کے لیے الگ اقامت کہی جاتی ہے تاکہ
لوگوں کو تنبیہ ہو جائے .

مغرب اور عشاء کے فرائض کے درمیان نفل نہ
پڑھے کیونکہ اس سے جمع میں خلل لازم آتا ہے . اگر
(مغرب کی نماز کے بعد) نفل ادا کرنے لگے یا کسی
اور اس میں مشغول ہو جائے (مثلاً کھانا ، پینا وغیرہ)
تو اقامت کا اعادہ کیا جائے گا . کیونکہ دونوں نمازوں
کے درمیان انفصال پیدا ہو گیا ہے . اور بہتر تو یہ تھا
کہ اذان کا اعادہ بھی کیا جاتا جیسا کہ جمع اول
(یعنی عرفات) میں مذکور ہوا ہے . مگر ہم نے اعادۂ
اقامت ہی پر کفایت کی کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ

نبی اکرم ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر شام کا کھانا تناول فرمایا اور پھر عشاء کے لیے صرف اقامت کہی۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس (دوسری) جمع کے لیے جماعت شرط نہیں۔ کیونکہ مغرب کو اپنے وقت سے مؤخر کیا جا رہا ہے۔ بخلاف عرفات میں جمع کرنے کے کیونکہ وہاں تو عصر کو اپنے وقت پر مقدم کیا جاتا ہے (لہذا اس صورت میں جماعت شرط ہے)۔

**مسئلہ:** اگر کوئی شخص (مزدلفہ میں آنے سے پہلے) مغرب کی نماز راستے ہی میں پڑھ لے۔ تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگی اور جب تک فجر طلوع نہ ہو اس پر اعادہ واجب ہے۔ (امام زفرؒ اور امام حسنؒ کا بھی یہی قول ہے)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ (مذکورہ صورت میں) نماز جائز ہوگی۔ البتہ مخالفت سنت کی وجہ سے کراہت لازم آئے گی۔

اگر مغرب کی نماز عرفات میں ادا کرے تب بھی یہی اختلاف ہے۔ (طرفین کے نزدیک جائز نہ ہوگی اور امام یوسفؒ کے نزدیک مع الکراهة جائز ہوگی)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس نے مغرب کی نماز اپنے وقت میں ادا کی ہے اس لیے اعادہ ضروری نہ

ہوگا ۔ جیسا کہ اگر طلوع فجر کے بعد ادا کرتا (تو اس صورت میں اعادہ واجب نہ تھا) ۔ البتہ مغرب کی نماز میں تأخیر کرنا (اور جمع کرکے پڑھنا) مسنون ہے ۔ لہذا ترک سنت کی بناء پر گناہگار ہوگا ۔

امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کی دلیل وہ روایت ہے جو بخاری اور مسلم میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسامہؓ سے فرمایا "اَلصَّلٰوةُ اَمَامَكَ" ۔ اس ارشاد کا مطلب ہے کہ نماز کا وقت (ابھی ہوا نہیں ، بلکہ) ابھی آگے ہے ۔ (یا یہ مطلب ہے کہ پڑھنے کی جگہ آگے یعنی مزدلفہ میں ہے)۔ اس روایت سے اشارۃً ثابت ہو رہا ہے کہ تأخیر واجب ہے ۔ اس کا وجوب اس بناء پر ہے تاکہ مزدلفہ میں جمع بین الصلاتین ممکن ہو ۔ لہذا جب تک فجر طلوع نہ ہو اس پر اعادہ واجب ہوگا تاکہ وہ جمع کرنے کی صفت سے موصوف ہو ۔ لیکن جب فجر طلوع ہو جائے تو جمع کرنا ممکن نہیں رہتا اس لیے اعادہ بھی ساقط ہو جاتا ہے ۔

**مسئلہ** : جب فجر طلوع ہو جائے تو امام سویرے سویرے منہ اندھیرے ہی لوگوں کو نماز پڑھا دے ۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس دن اندھیرے ہی میں یہ نماز پڑھائی تھی ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اندھیرے میں نماز پڑھنے میں حاجتِ وقوف کی تکمیل ہے. (کیونکہ نماز پڑھنے کے بعد وقوف کرناہوتا ہے لہذا سویرے نماز پڑھنےسے وقوف کے لیے فارغ ہو سکے گا) . اس لیے تغلیس جائز ہوگی جیسا کہ عرفہ میں عصر کی تقدیم . (یعنی جب وقوف کے مد نظر ایک نماز کا وقت پر مقدم کرنا جائز ہے تو ایک نماز کا اپنے ہی وقت میں جلد ادا کرنا جب کہ وقوف بھی کرنا ہو بدرجہ اولی جائز ہوگا) .

پھر امام اور لوگ وقوف کریں اور امام دعاء کرے . کیونکہ نبی اکرم ﷺ اس مقام (یعنی مشعر الحرام) پر کھڑے ہوئے تھے اور دعاء کرتے رہے تھے. جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کی دعاء امت کے حق میں حتی کہ خونوں اور مظالم کے بارے میں بھی منظور کرلی گئی . (یہاں ابن عباسؓ سے مراد کنانة بن عباسؓ ہیں . صاحب ہدایہ کا قول ہے کہ صرف ابن عباسؓ کہنا درست نہیں . کیونکہ محدثین کے نزدیک صرف ابن عباسؓ سے مراد عبداللہ بن عباسؓ ہوا کرتے ہیں) .

**مسئلہ** : ہمارے نزدیک یہ وقوف واجب ہے ، رکن نہیں ؛ حتی کہ اگر کسی نے عذر کے بغیر اسے چھوڑ دیا تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہوگی .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ وقوف رکن ہے

کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ''. اور اس جیسے امرِ قطعی سے رکنیت ثابت ہوتی ہے.

ہماری دلیل وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہل و عیال کے کمزور افراد کو رات کے وقت ہی آگے بھیج دیا. اگر وقوف رکن کی حیثیت رکھتا تو آنحضرت ﷺ ایسا نہ کرتے.

امام شافعیؒ کی پیش کردہ آیت میں ذکر کا لفظ آتا ہے اور یہ متفقہ طور پر رکن نہیں ہے. [سوال : اگر مذکورہ دلیل سے وقوف کی رکنیت ثابت نہیں ہوتی تو اس کے وجوب کا کہاں سے پتا چلا؟ صاحب ہدایہ جواب میں فرماتے ہیں کہ] وجوب کا پتا ہمیں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے چلا ''کہ جو شخص ہمارے ساتھ اس مقام پر وقوف کرے حالیکہ پہلے عرفات سے لوٹ چکا ہو (یعنی عرفات میں وقوف کر چکا ہو. کیونکہ وقوف عرفات رکن کی حیثیت رکھتا ہے اگر عرفات میں نہ ٹھہرے اور مزدلفہ میں وقوف کرے تو حج ناقص ہوگا) تو اس کا حج مکمل ہوگیا''. نبی اکرم ﷺ نے اتمام حج کو اس وقوف سے معلق فرمایا ہے. اور یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ یہ وقوف واجب ہے. ہاں اگر کسی عذر کی بناء پر مثلاً نحیف و نزار ہو یا

بیمار ہو یا عورت کو ازدحام کا خوف ہو ، ترک کردے تو اس پر کوئی چیز (بطور تاوان واجب) نہ ہوگی . جیسا کہ ہم روایت کر چکے ہیں (کہ آنحضرت ﷺ نے کنبے کے ضعیف افراد کو آگے بھیج دیا تھا) .

**مسئلہ**: امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ وادیِ مُحَسِّر کے علاوہ تمام مزدلفہ میں وقوف کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم پہلے روایت کر چکے ہیں .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جب آفتاب نکل آئے تو امام اور لوگ وہاں سے لوٹ آئیں یہاں تک کہ منی میں پہنچ جائیں . (صاحب ہدایہ فرماتے ہیں : عبد ضعیف (اللہ اس کی حفاظت فرمائے) کی یہ رائے ہے کہ مختصر القدوری کے نسخوں میں ایسے ہی مرقوم ہے اور یہ غلط ہے . صحیح بات یہ ہے کہ (طلوع آفتاب سے قبل) جب روشنی نمودار ہو جائے تو امام اور لوگ روانہ ہو جائیں . کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے طلوع آفتاب سے پہلے ہی مراجعت فرمائی تھی) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جمرۂ عقبہ سے رمی کی ابتداء کرے اور بطن الوادی کی طرف سے سات کنکریاں مارے . یاد رہے کہ کنکریاں چھوٹی چھوٹی ہوں . جب نبی اکرم ﷺ منٰی میں تشریف لائے تو کہیں رکے بغیر آپ نے جمرۂ عقبہ پر رمی کی اور فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکا کرو . کہ اگر

کہیں کنکری مارتے ہوئے کسی دوسرے کو لگ جائے تو وہ زخمی نہ ہو جائے اور اس کے لیے اذیت کا باعث نہ ہو۔

اگر بڑا سا کنکر مارا گیا تو بھی جائز ہوگا کیونکہ رمی کا مقصد اس سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ بڑے بڑے پتھر استعمال نہ کرے کیونکہ ان سے دوسروں کے زخمی ہونے اور اذیت پانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

**مسئلہ** : اگر عقبہ کے اوپر چڑھ کر کنکریاں مارے تو بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ عقبہ کے ارد گرد کی جگہ بھی جائے عبادت (اور رمی) ہی ہے۔ لیکن مذکورہ بالا روایت کی بناء پر مناسب یہ ہے کہ بطن الوادی کی طرف سے ماری جائیں۔ ہر کنکری مارنے کے ساتھ تکبیر کہی جائے۔ عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

**مسئلہ** : اگر تکبیر کی بجائے تسبیح کہہ دی تو بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ رمی کے آداب میں ذکر الٰہی ایک ضروری امر ہے اور تسبیح بھی ذکر الٰہی کا حصہ ہے۔ رمی کرنے کے بعد جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے (رمی کے بعد) وہاں وقوف نہیں فرمایا تھا۔

**مسئله** : جب پہلی کنکری مارنے لگے تو تلبیہات کہنا ختم کردے (کیونکہ اب اسے ہر کنکری کے کے ساتھ الله اکبر کہنا ہے) . نیز اس کی دلیل کے سلسلے میں ہم حضرت عبدالله بن مسعود والی روایت کا ذکر کر چکے ہیں . (صاحب هدایه نے اس سے پہلے اس سلسلے میں حضرت ابن مسعودؓ کی کوئی روایت نقل نہیں کی . **"لما روینا عن ابن مسعود"** غلط فہمی کی بناء پر کہا گیا ہے . ابن مسعودؓ کی روایت یوں ہے . **ان النبی صلی الله علیه وآله وسلم مازال یلبی حتی اتی جمرة العقبة"**. نیز حضرت جابرؓ نے روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے جب جمرۂ عقبه پر پہلی کنکری ماری تو آپ ﷺ نے تلبیه کہنا ختم کر دیا تھا .

**مسئله** : رمی کی صورت یوں ہے کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی پشت پر کنکری رکھے اور انگشت شہادت کی مدد لے . (دوسری انگلی یعنی انگشت شہادت حلقه بناتے ہوئے انگوٹھے کے اگلے سرے پر آ جائے گی اور کنکری تقریباً انگوٹھے کے ناخن پر ہوگی) . کنکری مارنے والے سے کنکری کے گرنے کے مقام تک تقریباً پانچ ذراع یعنی سات آٹھ فٹ کا فاصله ہونا چاہیے . امام حسنؒ نے امام ابو حنیفهؒ سے اسی طرح ذکر کیا ہے . دوسری بات یه ہے که اس سے کم فاصلے پر کنکری کا گرنا "کنکری مارنا" نہیں ہوتا بلکه محض

پھینک دینا ہوتا ہے .

اگر کنکری کو (مارنے کی بجائے) صرف پھینک دے تو بھی جائز ہوگا . کیونکہ اس نے قدم تک تو رمی کر دی . مگر چونکہ یہ (پاس ہی پھینک دینا) سنت کے خلاف ہے . لہذا وہ (مخالفت سنت کی بناء پر) گناہگار ہوگا .

**مسئلہ :** اگر کنکری جمرۂ عقبہ سے دور جا پڑے تو جائز نہ ہوگا . کیونکہ ایک خاص مقام تک ہی کنکری کا مارنا عبادت ہے . (ہر جگہ دور و نزدیک کنکری پھینک دینا عبادت نہیں ہے) .

**مسئلہ :** اگر ساتوں کنکریاں ایک بار ہی مار دے تو یہ ایک ہی (کنکری) شمار ہوگی . کیونکہ سات بار الگ الگ مارنا نص سے ثابت ہے .

**مسئلہ :** جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھائی جاسکتی ہیں . البتہ جمرۂ عقبہ ہی سے اٹھانا مکروہ ہے . کیونکہ جمرہ کے پاس جو کنکریاں پڑی ہیں وہ ایک دفعہ مارے جانے کی بناء پر مردود ہو چکی ہیں . ارشاد نبوی سے بھی ثابت ہے . (ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا . یا رسول اللہ ہر سال جو اس قدر کثیر کنکریاں ماری جاتی ہیں تو کیا یہ ہر سال کم ہو جاتی ہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے

جو قبول ہو جاتی ہیں وہ یہاں سے اٹھا لی جاتی ہیں . ورنہ یہاں تو کنکریوں کے پہاڑ بن جاتے) ! پس ان (جمرۂ عقبہ پر ماری ہوئی) کنکریوں کو اٹھانے میں بدشگونی ہے . بدیں ہمہ اگر وہیں سے اٹھا کر مار دیں تو فریضہ ادا ہو جائے گا کیونکہ اس صورت میں بھی فعل رمی تو موجود ہے .

**مسئلہ** : احناف کے نزدیک ہر اس چیز سے رمی کرنا جائز ہے جو زمین کی جنس سے ہو (مثلاً پتھریلے یا ریتلے کنکر یا مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے وغیرہ) امام شافعیؒ صرف پتھریلی کنکریوں کے جواز کے قائل ہیں . احناف کا کہنا ہے کہ مقصد تو فعل ہے اور یہ مقصد پتھر کی کنکریوں کی طرح مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں سے بھی حاصل ہو جاتا ہے. (احناف پر اعتراض کیا گیا کہ اگر ہر اس چیز سے ، جو زمین کی جنس سے ہو ، رمی جائز ہے تو سونا اور چاندی بھی تو زمین کی جنس سے ہیں . مصنفؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ) سونے یا چاندی سے رمی جائز نہ ہوگی . مثلاً اگر سونے یا چاندی کے سکے جمرہ پر پھینکنے لگے تو اسے رمی نہیں کہا جاتا . بلکہ ''نچھاور کرنا'' کہتے ہیں . (اور مقصد نچھاور کرنا نہیں بلکہ رمی کرنا ہے) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ رمی سے فارغ ہونے کے بعد اگر چاہے تو جانور ذبح کرے .

پھر حلق یا قصر کرے . (حلق سے مراد پورے سر کا منڈوانا اور قصر سے مراد بال کٹوانا ہے) نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آج کے دن امور حج میں سے ہمارا پہلا کام رمی ہوگا اور اس سے فراغت پاکر ہم جانور ذبح کریں گے پھر ہم سر منڈوائیں گے .

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ذبح اور حلق احرام کے (مکمل ہونے اور) کھولنے کے اسباب سے ہیں . حتی کہ محصر بھی ان امور سے فارغ ہونے پر احرام کھول سکتا ہے . لہذا رمی کو ذبح اور حلق پر مقدم کیا جائے گا . (محصر وہ شخص ہے جسے حدود حرم میں جانے سے قبل ہی روک دیا جائے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رض کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا تھا تو آپ ﷺ نے قربانی کے جانور مکہ مکرمہ بھیج دیے تاکہ وہاں ذبح کر دیے جائیں اور بعد میں آپ ﷺ نے اور صحابہ نے حلق کرا کے احرام کھول دیے) .

ذبح اور حلق میں ذبح مقدم ہوگا کیونکہ احرام کے دوران بال کٹوانا امور ممنوعہ سے ہے لہذا ذبح کے بعد احرام کھول دیا جائے گا اور حلق اس کے بعد ہوگا.

مصنف رح ھدایہ فرماتے ہیں کہ امام قدوری رح نے ذبح کے ساتھ "إنْ أَحبَّ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں .

کہ اگر چاہے تو ذبح کرے . اس کی وجہ یہ ہے کہ مفرد کے لیے جانور کی قربانی دینا نفل کی حیثیت رکھتا ہے . (اگر ذبح کرے تو باعث اجر و ثواب ہے اگر نہ ذبح کرے تو گناہگار نہ ہوگا) . یاد رہے کہ یہ مذکورہ مسائل حج مفرد کے بارے میں بیان کیے جا رہے ہیں . (افراد ، قِران اور تمتع کی تفصیل آیندہ اوراق میں بیان کی جا رہی ہے) .

حلق اور قصر میں حلق کو فوقیت حاصل ہے . آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی سر منڈوانے والوں پر رحم و کرم فرمائے . آپ ﷺ نے تین بار یہ دعائیہ جملہ دہرایا . اس حدیث سے عیاں ہے کہ آپ ﷺ نے سر منڈوانے والوں کو اللہ تعالی کے رحم و کرم کا مستحق قرار دیا . نیز حلق میں یہ حکمت بھی ہے کہ پورا سر منڈانے سے سر کا میل کچیل صاف ہو جاتا ہے اور مقصد بھی یہی ہے . لیکن بال کتروانے کی صورت میں صفائی نامکمل رہتی ہے . جیسے وضو کے مقابلے میں غسل (یعنی صرف وضو سے اس قدر صفائی ممکن نہیں جس قدر غسل سے ہوتی ہے . پس وضو قصر کے مشابہ ہے اور غسل حلق کے) .

**مسئلہ** : حلق کی صورت میں سر کے مسح کی طرح سر کی چوتھائی کا اعتبار کیا جائے گا . (یعنی جس طرح مسح رأس میں کم از کم سر کے چوتھائی حصے پر مسح

ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح حلق میں بھی سر کی چوتھائی کا اعتبار ہوگا، اس سے کم حصہ منڈوانا قابل اعتبار نہ ہوگا)۔ بہر حال فضیلت پورے سر کے منڈوانے میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اقتداء کا تقاضا یہی ہے۔

تقصیر یعنی بال کتروانے کی صورت یہ ہے کہ سر کے بالوں سے ہاتھ کی انگلیوں کی مقدار کتر دیے جائیں۔

**مسئلہ** : (ذبح اور حلق کے بعد) عورتوں سے مباشرت کرنے کے علاوہ باقی تمام امور (جو بحالت احرام ممنوع تھے) حلال قرار پائیں گے۔ امام مالکؒ عورتوں کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی ممنوع کہتے ہیں۔ کیونکہ خوشبو مباشرت کے دواعی سے ہے۔ (اگر عورتیں خوشبو لگائے ہوئے ہوں تو مرد میں مباشرت کے تقاضے شدید ہو جاتے ہیں)۔ ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عورتوں کے سوا ہر چیز مباح ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ بہر صورت قیاس پر مقدم ہوگا۔

**مسئلہ** : ہمارے نزدیک فرج کے علاوہ بھی مباشرت جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ صورت بھی "عورتوں کے ساتھ شہوت پوری کرنے کے" زمرے میں آتی ہے۔ لہذا اتمام احلال تک تأخیر ضروری ہوگی۔ (احلال یا حلال ہونے کی تکمیل طواف کے بعد ہوگی)۔ امام شافعیؒ کا اس مسئلے میں اختلاف منقول ہے۔

مسئلہ : ہمارے نزدیک رمی اسباب تحلل سے نہیں (کہ رمی کرنے کے بعد احرام کھول سکے اور احرام کی بناء پر ممنوع امور مباح ہو جائیں) . البتہ امام شافعیؒ اسے اسباب تحلل میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حلق کی طرح رمی کے لیے بھی یوم النحر مقرر ہے تو رمی کی طرح حلق بھی اسباب تحلل سے ہوگا .

علماء احناف اس کے جواب، میں کہتے ہیں کہ جو چیز محلل ہوتی ہے اگر اس کا وقت مقرر سے پہلے ارتکاب کیا جائے تو وہ جنایت شمار ہوتی ہے . جیسا کہ حلق کی صورت میں (اگر اوقات مقررہ سے پہلے بال کٹوائے تو اس کے ذمے جنایۃ لازم آئے گی) مگر رمی اوقات مقررہ سے پہلے کرنے سے جنایۃ لازم نہیں آتی . (احناف پر سوال کیا گیا کہ اگر اوقات مقررہ سے پہلے احرام کی حالت میں رمی جنایۃ نہیں تواسی طرح طواف بھی جنایۃ نہیں . مگر آپ طواف کو محلل تسلیم کرتے ہیں اور رمی کو نہیں . مصنفؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ) ہمارے اصول کے مطابق آپ کا اعتراض درست نہیں کیونکہ ہم تو حلق کو محلل قرار دیتے ہیں نہ کہ طواف کو . (صرف طواف کی عظمت کی خاطر احرام کو طواف تک باقی رکھا جاتا ہے) .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ نحر کے دن یا دوسرے یا تیسرے روز مکہ مکرمہ آئے (ایام نحر

سے مراد ذی الحجہ کی دسویں گیارھویں اور بارھویں تاریخ ہے) اور بیت اللہ کے گرد سات چکر لگا کر طواف زیارت کی تکمیل کرے. امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ حلق کرانے کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لائے. بیت اللہ کا طواف فرمایا اور پھر منیٰ میں واپس جا کر ظہر کی نماز ادا فرمائی.

مسئلہ : طواف زیارت کا وقت ایام نحر ہی ہیں. اللہ تعالی کے اس ارشاد : "**ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام** (ای یذکروا اسم اللہ علی الذبح ثم عطف علیہ قولہ) **فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر. ثم لیقضوا تفثھم ولیوفوا نذورھم ولیطوفوا بالبیت العتیق**" میں طواف کا عطف ذبح پر ہے. (چونکہ معطوف علیہ اور معطوف کا حکم ایک ہی ہوتا ہے) لہذا ذبح اور طواف کا وقت ایک ہی ہوگا (اس لیے طواف ایام نحر سے مقدم نہیں ہوسکتا).

مسئلہ: یوم نحر کی فجر کے طلوع ہونے پر طواف زیارت کے وقت کی ابتداء ہوگی. کیونکہ طلوع فجر سے پہلے رات کا حصہ وقوف عرفہ کے لیے مخصوص ہے اور طواف زیارت کا وقت وقوف عرفہ سے مؤخر ہوتا ہے. ایام نحر میں پہلے دن یعنی دسویں ذی الحجہ کو فوقیت حاصل ہے جیسا کہ قربانی کے لیے دسویں کا دن افضل شمار کیا جاتا ہے. اور حدیث میں وارد ہے. کہ

اوقات میں سے اول حصے کو فضیلت ہوتی ہے ۔ (نوٹ : اس مضمون کی کوئی روایت دستیاب نہیں البتہ اجماع سے یہ فضیلت ضرور ثابت ہے) ۔

**مسئلہ :** اگر طواف کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر چکا ہو تو طواف زیارت میں رمل کی ضرورت نہیں ۔ ورنہ بصورت دیگر اس طواف میں رمل کرے اور طواف سے فراغت پاکر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے (ہر طواف کے بعد سعی نہیں) کیونکہ سعی صرف ایک بار مشروع ہے اور اسی طرح رمل بھی ایسے طواف میں جس کے بعد سعی ہو صرف ایک بار ہی مشروع ہے ۔

**مسئلہ :** طواف زیارت کے بعد دو رکعت نماز ادا کرے کیونکہ ہر طواف خواہ وہ فرض ہو یا نفل، اس کے اختتام پر دو رکعت ضروری ہیں ۔ اس کی تائید میں ہم طواف قدوم کے بیان میں حدیث پیش کر چکے ہیں ۔

**مسئلہ :** امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ (طواف زیارت کی تکمیل کے بعد) بیویوں سے مباشرت بھی مباح ہے ۔ لیکن یہ یاد رہے کہ تحلیل حلق سے ہوتی ہے نہ کہ اس طواف سے ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حلق سے تحلیل کا عمل (طواف کی تکمیل تک) مؤخر کر دیا گیا ۔ (یعنی طواف زیارت کے احترام و تقدس

کے پیش نظر عمل تحلیل مؤخر کیا گیا ورنہ تحلیل کا اصل سبب تو حلق تھا) .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ طواف زیارت حج میں فرض ہے اور اسے رکن کی حیثیت حاصل ہے . کیونکہ ارشاد الہی : "ولیطوفوا بالبیت العتیق" میں اسی طواف کا حکم دیا گیا ہے . اسے طواف افاضہ اور طواف یوم النحر بھی کہا جاتا ہے . اسے ایام نحر سے مؤخر کرنا جائز نہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ انہیں ایام کے ساتھ مخصوص ہے .

اگر طواف کو ایام مذکورہ سے مؤخر کر دیا تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق اس پر دم لازم ہوگا . إن شاء اللہ ہم باب الجنایات میں اس کی تفصیلات بیان کریں گے .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ (طواف کی تکمیل کے بعد) منی لوٹ جائے اور وہیں قیام کرے . جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ طواف سے فارغ ہو کر منی تشریف لے گئے تھے . نیز ابھی اس کے ذمے رمی باقی ہے اور رمی کا مقام منی ہے .

مسئلہ : ایام نحر کے دوسرے دن سورج کے ڈھل جانے پر تینوں جمرات پر رمی کرے . مسجد خیف سے متصل جمرے سے رمی کی ابتداء کرے . سات

کنکریاں مارے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہے اور کچھ دیر وہاں وقوف کرے ، پھر ساتھ والے جمرے پر اسی طرح رمی کرکے کچھ دیر رکے . پھر آخر میں جمرۂ عقبہ پر رمی کرے لیکن وقوف نہ کرے . حضرت جابرؓ نے ایک مفصل حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے نُسک حج کو اسی طرح پوری وضاحت سے روایت کیا ہے .

مسئلہ : جمرۂ اولی اور ثانیہ کے پاس اسی مقام پر قیام کرے جہاں دوسرے لوگ کرتے ہیں . (یہ مقام وادی کا بالائی حصہ ہے) . اور وہاں حمد و ثناء اور تکبیر و تہلیل میں مصروف رہے . اور حضور ﷺ پر درود شریف پڑھے اور آخر میں اپنے ہاتھ (کندھوں کے متوازی) اوپر اٹھا کر بارگاہ الہی میں دعا کرے . حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سات مقامات کے علاوہ اور کہیں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں . جمرۂ اولی و ثانیہ بھی انہیں (سات مقامات) میں شامل ہیں . ہاتھ اٹھانے سے مراد دعاء کے لیے ہاتھ اٹھانا ہیں .

مناسب یہ ہے کہ اس مقام پر تمام مسلمانوں کے لیے بخشش کی دعاء کرے آنحضرت ﷺ نے اس طرح دعاء فرمائی تھی . ''اے اللہ ! تمام حج کرنے والوں کو بخشش دے اور ان لوگوں کو بھی اپنی بخشش سے بہرہ ور فرما جن کے لیے یہ حجاج دعاء کر رہے ہیں'' !

اس مسئلے میں اصول یہ ہے کہ ہر ایسی رمی جس کے بعد بھی رمی ہے اس کے بعد وقوف کرے اور دعاء کرے، کیونکہ اس حالت میں انسان وسط عبادت میں ہوتا ہے (اور قبولیت دعاء کا مناسب موقع ہوتا ہے). اور جس رمی کے بعد رمی نہ ہو وہاں وقوف بھی مشروع نہیں، کیونکہ عبادت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہے. اسی بناء پر نحر کے دن بھی جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد وقوف نہیں کیا جاتا.

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگلے دن بھی سورج ڈھلنے پر تینوں جمروں پر اسی طرح رمی کرے. (رمی سے فراغت کے بعد) اگر مکہ مکرمہ جانا چاہتا ہے تو جا سکتا ہے. اور اگر منی میں قیام کرنا چاہتا ہے تو چوتھے دن بھی زوال شمس کے بعد جمرات ثلاثہ پر رمی کرے. اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "پھر جو کوئی جلدی کرکے دو ہی دن میں واپس ہوگیا تو کوئی حرج نہیں. اور جو کچھ زیادہ دیر ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں. بشرطیکہ یہ دن اس نے تقوی کے ساتھ بسر کیے ہوں" (یعنی منی سے مکے کی طرف واپسی خواہ بارہ ذی الحجہ کو ہو یا تیرھویں تاریخ کو دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں). منی میں قیام کرنا باعث فضیلت ہے. ابو داؤد میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انتظار فرمایا حتی کہ چوتھے روز

بھی تینوں جمروں پر رمی فرمائی .

چوتھے روز کی فجر کے طلوع ہونے سے پہلے (رمی کے بغیر بھی منی سے) لوٹ سکتا ہے . لیکن طلوع فجر کے بعد رمی کرنے کے بغیر نہیں جا سکتا ، (کیونکہ طلوع فجر سے رمی کا وقت شروع ہو جاتا ہے) . اس مسئلے میں امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے .

مسئلہ : اگر چوتھے روز طلوع فجر کے بعد اور زوال شمس کے پہلے پہلے رمی کرے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک استحسان کے طور پر جائز ہوگا . (قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ زوال شمس کے بعد رمی کرے لیکن چوتھے دن چونکہ رمی ضروری نہیں لہذا زوال شمس سے پہلے بھی جائز ہو سکتی ہے) . صاحبین امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) فرماتے ہیں کہ دیگر ایام رمی کی طرح اس دن بھی زوال شمس سے پہلے جائز نہ ہوگی ، اگرچہ تیسرے دن کے بعد اسے واپس جانے کی اجازت تھی . مگر جب وہ اس رخصت اور رعایت سے متمتع نہ ہوا تو اس روز کے احکام بھی سابقہ ایام سے مختلف نہ ہوں گے .

امام اعظمؒ کے مسلک کی تائید حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے ہوتی ہے . دوسری وجہ یہ ہے کہ جب چوتھے روز اسے ترک رمی کی رعایت حاصل

ہے تو یہی رعایت اوقات رمی میں بطریق اولی حاصل ہوگی (یعنی جب چوتھے دن کی رمی ہی لازم نہیں تو اسے کسی متعین وقت سے مخصوص کرنا مناسب نہ ہوگا). رہا ایام گزشتہ کا معاملہ تو مشہور روایت کی بناء پر ان میں رمی کے اوقات زوال شمس کے بعد متعین کیے گئے ہیں . نیز ان دنوں میں ترک رمی کی رعایت بھی موجود نہیں ہے ، اس لیے ان کے اوقات ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق متعین ہوں گے .

مسئلہ : یوم نحر کو رمی کا اول وقت طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے . (مسنون وقت زوال شمس کے بعد ہے). امام شافعیؒ کے نزدیک اول وقت نصف شب کے بعد شروع ہو جاتا ہے . آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے گڈریوں (اور ضعیف افراد) کو اجازت دی تھی کہ وہ رات کے وقت ہی رمی کرلیں (تاکہ بعد میں اپنے ریوڑ کی نگہداشت وغیرہ کے لیے فارغ ہو سکیں) .

ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جمرۂ عقبہ پر صبح کے وقت ہی رمی کیا کرو ؛ اور دوسری روایت میں "حتی تطلع الشمس" کے الفاظ ہیں یعنی طلوع شمس کے بعد رمی کیا کرو . پہلی روایت سے اصل وقت کا ثبوت ملتا ہے اور دوسری سے فضیلت کا . امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت میں "رات" سے

مراد دوسری اور تیسری رات ہے (یعنی گیارہ اور بارہ تاریخ کی) ۔ چونکہ نحر کی رات (یعنی دسویں تاریخ کی رات) تو مزدلفہ میں وقوف کے لیے مخصوص ہے ، اور رمی وقوف سے متأخر ہوتی ہے لہذا رمی کا وقت ضرورت کے مدنظر رات کے گزرنے کے بعد ہوگا ۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ وقت غروب شمس تک باقی رہتا ہے ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :
"إِنَّ أَوَّلَ نُسُكِنَا فِي هَذَا الْيَوْمِ الرَّمْيُ" یعنی اس دن افعال حج سے ہمارا پہلا کام رمی ہوگا ۔ آنحضرت ﷺ نے "یوم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے ، اور یوم کا اختتام غروب شمس سے ہوتا ہے ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ رمی کا وقت زوال شمس تک باقی ہوگا ۔ لیکن ہماری پیش کردہ حدیث ان پر حجت ہوگی ۔

مسئلہ : اگر رمی میں رات تک تأخیر کر دی گئی تو کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا ۔ اس سلسلے میں گڈریوں والی روایت بیان کی جا چکی ہے ۔ اگر رمی دوسرے دن تک ملتوی کر دے تو دوسرے دن ہی رمی کرے ، کیونکہ دوسرا دن بھی جنس رمی کا وقت ہے ۔ مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس پر دم (یعنی قربانی کا جانور دینا) واجب ہوگا کیونکہ اس نے

وقتِ مقرر سے تأخیر کا ارتکاب کیا ہے . امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تَأْخِیرُ النُّسُكِ عَنْ وَقْتِہٖ یُوجِبُ الدَّمَ ، یعنی افعال حج سے کسی فعل کو وقت معین سے مؤخر کرنے پر دم لازم آتا ہے .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ سواری پر بیٹھ کر رمی کرنا بھی جائز ہوگا ، کیونکہ اس صورت میں بھی فعل رمی پایا جاتا ہے . اور ہر وہ رمی جس کے بعد بھی رمی ہو پیدل رمی کرنے میں فضیلت ہے . اگر جمرۂ عقبہ کی رمی کی طرح بعد میں رمی نہ ہو تو سوار ہو کر بھی کی جا سکتی ہے . کیونکہ پہلی اور دوسری رمی کے بعد وقوف بھی ہوتا ہے اور دعاء بھی ، جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں . اور دعاء و التجاء کے لیے پیدل صورت تضرع اور خشوع و خضوع کے زیادہ مناسب ہے . فضیلت کی مذکورہ صورت امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے .

مسئلہ : ایام رمی کی راتوں کے دوران منی میں قیام نہ کرنا مکروہ ہے ، کیونکہ نبی اکرم ﷺ ان راتوں کے دوران منی ہی میں قیام فرمایا کرتے تھے . اور حضرت عمرؓ تو وہاں قیام نہ کرنے والوں کو سرزنش فرمایا کرتے تھے .

اگر مذکورہ راتوں میں عمداً اور ارادۃً کسی دوسری جگہ قیام کرے تو احناف کے نزدیک اس پر

کوئی تاوان واجب نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ رمی کی راتوں کو منی میں قیام کرنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے دن آسانی سے رمی کی جا سکے۔ ورنہ قیام اللیل افعال حج کا حصہ نہیں ہے کہ اس کے ترک سے تاوان لازم آئے۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ خود منی میں رمی کے لیے قیام کرنا اور اپنا مال و متاع مکہ مکرمہ بھیج دینا مکروہ ہے۔ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ ایسا کرنے سے صرف منع ہی نہ فرماتے بلکہ سرزنش بھی کیا کرتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کرنے سے دلی طمانینت اور سکون اٹھ جاتا ہے اور سامان کے ضائع ہونے کا خدشہ دامن گیر رہتا ہے۔

**مسئلہ** : جب (منی سے فارغ ہوکر) مکہ مکرمہ کی طرف مراجعت کرے تو مقام محصب پر اترے (محصب منی اور مکہ کے درمیان ایک جگہ ہے) اسے ابطح بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں۔۔ صحیح روایت کے مطابق۔۔رسول اکرم ﷺ نے ارادۃً نزول فرمایا تھا۔ اب وہاں قیام کرنا طریق مسنون ہوگا۔ اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ہم کل خیف بنی کنانہ کے مقام پر اتریں گے (محصب، ابطح اور خیف بنی کنانہ ایک

ہی جگہ کے نام ہیں ۔ یہ وہی جگہ ہے) جہاں مشرکین مکہ نے اپنے شرک و الحاد پر قائم رہنے کی قسم کھائی تھی ۔ اس بات سے آنحضرت ﷺ کا اشارہ بنی ہاشم کے ساتھ قطع تعلقات کی طرف تھا (اور بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا تھا) ۔

مذکورہ بالا روایت سے واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں قصداً وارادةً نزول فرمایا تھا تاکہ مشرکین اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھ لیں کہ اللہ جل شانہ نے اپنے نبی ﷺ اور اس کے صحابہؓ کو کس قدر عنایات وافرہ سے سرفراز فرمایا ہے ۔ (وہی مکۂ مکرمہ کی سر زمین جہاں مسلمانوں کا رہنا دوبھر ہوگیا تھا آج ان کے قدموں کو چوم کر عظمت و تقدس سے بہرہ ور ہو رہی تھی) ، لہذا محصب میں قیام کرنا طواف کے دوران رمل کی طرح سنت نبوی ہوگا ۔

**مسئلہ :** امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ پھر مکہ مکرمہ میں داخل ہوکر بیت اللہ کے گرد سات چکر لگائے ۔ اس طواف میں رمل نہیں ہے ۔ اسے طواف صدر یعنی رجوع اور طواف وداع سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ، کیونکہ یہ بیت اللہ کا آخری طواف ہوتا ہے اور ازاں بعد بیت اللہ کو الوداع کہہ کر روانگی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے ۔ یہ طواف ہمارے نزدیک واجب ہے ۔ (امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے) ۔ امام شافعیؒ (اور امام مالکؒ)

کو اس سے اختلاف ہے (وہ اسے سنت قرار دیتے ہیں) . ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص بیت اللہ کا حج کرے اس کا بیت اللہ سے آخری عہد یہ طواف ہی ہے . حائضہ عورتوں کو (طواف نہ کرنے کی) رخصت ہے .

البتہ اہل مکہ پر یہ طواف واجب نہیں کیونکہ انہیں بیت اللہ کو الوداع کہہ کر کہیں جانا نہیں ہوتا . طواف وداع میں رمل نہ کرے ، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ رمل ایک بار ہی مشروع ہے (اور اس کی ادائیگی طواف قدوم میں ہو چکی ہے) . اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ طواف سے فراغت کے بعد دو رکعت بھی ادا کی جائیں .

مسئلہ : (طواف وداع سے فراغت کے بعد) چاہ زمزم کے پاس آ کر آب زمزم پیے . حضور نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس چاہ زمزم سے ڈول نکالا ، اس سے آب زمزم نوش فرمایا اور باقیماندہ پانی پھر کنوئیں میں انڈیل دیا .

مسئلہ : مستحب صورت یہ ہے کہ باب کعبہ کے پاس آئے اور دہلیز کو بوسہ دے . پھر ملتزم کے پاس آئے . ملتزم حجر اسود اور باب کعبہ کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں . اس پر اپنا چہرہ اور سینہ لگائے اور کچھ لمحات کے لیے بیت اللہ کے پردوں کو الوداعی

جذبات کا اظہار کرے ، اور پھر اپنی منزل کی طرف روان ہوجائے . ابو داؤد میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مقام ملتزم پر ایسے ہی کیا تھا .

ہمارے مشائخ کا کہنا ہے کہ جب بیت اللہ سے الوداع ہوکر لوٹے تو الٹے پاؤں چلے تاکہ اس کا چہرہ بیت اللہ کی جانب رہے . بیت اللہ کے فراق میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور اس کی حرکات و سکنات سے حسرت و افسوس اور غم واندوہ کے جذبات آشکارا ہوں . اسی طرح الٹے پاؤں چلتا ہوا مسجد کی حدود سے نکل جائے .

اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ امور حج کا بیان تکمیل پذیر ہوا .

——:o:——

## فصل

# حج کے متفرق مسائل

مسئلہ : اگر محرم مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہو اور سابقہ بیان کردہ طریق کے مطابق عرفات میں پہنچ کر وقوف کرے تو طواف قدوم اس کے لیے ضروری نہ ہوگا ، کیونکہ اس نے حج کی ابتداء ایسے طور پر کی ہے جس پر تمام افعال حج مترتب ہوتے ہیں . اور اب طواف قدوم کو غیر مترتب طریق سے ادا کرنا مسنون نہ ہوگا (یعنی مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام طواف قدوم ہوتا ہے . مگر جب محرم نے اپنے حج کی ابتداء ہی وقوف عرفات سے کی تو اب اس پر طواف قدوم کی قضاء نہ ہوگی کہ کہیں درمیان میں وقت نکال کر مکہ مکرمہ آئے اور طواف قدوم کرے ، کیونکہ ایسا کرنے سے افعال حج کی ترتیب میں بدنظمی پیدا ہوگی) .

طواف قدوم کے ترک کرنے کی بناء پر اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا . کیونکہ طواف قدوم سنت کا درجہ رکھتا ہے . اور امر مسنون کے ترک پر تاوان لازم نہیں

آتا۔ (البتہ امور واجبہ کے ترک پردم لازم ہوتا ہے)۔

مسئلہ : جس شخص کو وقوف عرفہ کے دن (یعنی ۹ ذی الحجہ کو) زوال شمس سے یوم نحر کی طلوع فجر سے پہلے پہلے میدان عرفات میں وقوف میسر آجائے وہ سعادتِ حج سے بہرہ ور ہو جائے گا۔ احناف کے نزدیک وقوف کا اولین وقت زوال شمس سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال شمس کے بعد میدان عرفات میں وقوف فرمایا تھا۔ اور یہ وقت اول کا بیان ہے۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو رات کے وقت بھی وقوف عرفہ میسر آگیا اس نے حج کو پالیا۔ مگر جو شخص رات کو بھی اس سے محروم رہا وہ حج کی سعادت سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ اور یہ آخر وقت کا بیان ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول یوں بھی منقول ہے کہ وقوف کا اول وقت طلوع فجر یا طلوع شمس سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری پیش کردہ احادیث ان کے خلاف حجت ہیں۔ (اصل بات یہ ہے کہ احناف اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی زوال شمس ہی کو وقوف کا اول وقت قرار دیتے ہیں)۔

مسئلہ : اگر میدان عرفات میں کچھ دیر ہی وقوف کرکے لوٹ آیا تو ہمارے نزدیک جائز ہوگا، کیونکہ

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد گرامی : **الحج عرفة امن وقف بعرفة ساعةً من لیل أو نهارٍ فقد تمّ حجه** میں لفظ "أوْ" کا استعمال فرمایا ہے . اور یہ کلمۂ تخییر ہے .

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب تک دن کے حصے اور رات کے کچھ اوقات تک وہاں وقوف نہ کرے جائز نہ ہوگا . ہماری پیش کردہ حدیث امام مالکؒ کے خلاف حجۃ ہے .

مسئلہ : اور جو شخص سوتے میں یا بے ہوشی کی حالت میں (سواری پر) عرفہ سے گزر گیا یا وہاں سے گزرا ، اور اسے علم ہی نہ تھا کہ یہ میدان عرفات ہے ، تو بھی جائز ہوگا (یعنی ان لوگوں کا وقوف درست تسلیم کیا جائے گا) ، کیونکہ اصل شرط اور رکن تو میدان عرفات میں کچھ دیر قیام ہے اور سونے یا بے ہوشی کی حالت میں بھی عرفات کو طے کرنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف ہوتا ہے جیسا کہ روزے کی صورت میں (یعنی اگر کوئی شخص سحری کھا کر سو جائے اور غروب آفتاب کے وقت بیدار ہو تو اس کا روزہ درست ہوگا) . البتہ نماز کی صورت اس سے الگ ہے ، کیونکہ بے ہوشی کے ہوتے ہوئے نماز کا باقی رہنا ممکن نہیں ہوتا . جہالت واقعی نیت کے سلسلے میں مخل ہوتی ہے (یہ عبارت دراصل ایک سوال کا جواب ہے کہ

وقوف عرفہ عبادت ہے ، اور عبادت میں نیت شرط کا درجہ رکھتی ہے . اور مذکورہ صورت میں گزرنے والے کو جب میدان عرفات کا علم ہی نہیں اور نہ پتا ہے کہ یہاں وقوفہ کیا جاتا ہے تو نیت کیسے کرے گا ؟ اس سوال کے جواب میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ) ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جہالت کی صورت میں نیت ممکن نہیں . مگر حج کے ہر رکن کے لیے الگ الگ نیت کرنا شرط نہیں ، (بلکہ ایک بار نیت کرلی تو کافی ہوگی ، کیونکہ جب ہر شخص احرام باندھتا ہے تو کہتا ہے : "اَللّٰهُمَّ اِنِّي اُرِيدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِي". یہ نیت حج کے تمام ارکان کی ادائیگی کے لیے کافی ہوگی) . .

**مسئلہ** : اگر کسی شخص پر مسلسل بے ہوشی طاری ہوگئی ، لیکن اس کی جانب سے اس کے رفقاء نے نیت کر کے احرام باندھ لیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہوگا . صاحبینؒ عدم جواز کے قائل ہیں .

اگر اس شخص نے کسی دوسرے کو کہہ دیا کہ جب میں بے ہوش ہو جاؤں یا مجھ پر نیند غالب ہو جائے تو میری طرف سے نیت کرکے احرام باندھ لینا ، پھر مأمور نے اس کی نیت کرتے ہوئے احرام باندھا تو ہمارے اصحاب کے نزدیک اجماعی طور پر درست ہوگا . حتی کہ جب غشی کی حالت سے افاقہ

ہو جائے یا نیند سے بیدار ہو جائے اور افعال حج کی ادائیگی میں شامل ہو جائے تو جائز ہوگا .

صاحبین مذکورہ مسئلے (یعنی اس کی طرف سے اس کے رفقاء از خود نیت کرکے احرام باندھ لیں) کی دلیل میں کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں اس شخص نے خود احرام نہیں باندھا ، (اور نہ خود نیت کی ہے) ، اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے کی اجازت دی تھی ، کیونکہ اس کی طرف سے اجازت کی کوئی صراحت موجود نہیں . نیز مذکورہ صورت میں دلالةً بھی اجازت کا کوئی ثبوت نہیں ، کیونکہ دلالت کا انحصار علم و معرفت پر ہوتا ہے (اور بے ہوش شخص کو تو میدان عرفات اور وقوف کا علم تک بھی نہیں) اور صراحت و دلالت کے بغیر احرام کی اجازت ثابت کرنا ایک ایسا (موہوم) امر ہے جو اکثر فقہاء کی علمی حدود سے خارج ہے ، تو عوام (اور کم عام لوگوں) کو اس اجازت کا کیسے پتا چلے گا ؟ یہ معاملہ اس صورت کے خلاف ہے کہ جب بے ہوش ہونے سے پہلے کسی دوسرے کو صریح الفاظ میں ایسا کرنے کے لیے کہہ دے ، (کہ اگر میں بے ہوش ہو جاؤں تو میری طرف سے بھی نیت حج کے ساتھ احرام باندھنا) .

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان اپنے ہم سفر ساتھیوں کے ساتھ رفاقت کے روابط و ضوابط قائم

کر لیتا ہے تو گویا وہ ان تمام امور میں جن کی ادائیگی سے خود قاصر رہتا ہے اپنے رفقاء کے تعاون کا طالب شمار کیا جاتا ہے . اور اس سفر میں تو سب سے اہم چیز ہی احرام ہے . پس اس دلالت (اور وضاحت) کے پیش نظر اس کی اجازت ثابت ہوگی ، اور دلیل کے مد نظر علم بھی ثابت ہے . ایسا علم حکم کا دار و مدار بن سکتا ہے (یعنی بے ہوش ہونے سے قبل اسے یہ علم تھا کہ مجھے احرام باندھنا ہے حج کی نیت کرنا ہے اور وقوف عرفہ وغیرہ دیگر افعال حج کی ادائیگی کرنا ہے تو یہ سابقہ علم ہی اجازت کے ثبوت اور احکام کے مترتب ہونے کے لیے کافی ہے ، جیسا کہ سفر میں قصر کرنا . قصر دراصل سہولت کے مد نظر ہے کہ سفر میں عموماً قلت وقت اور دیگر کئی تکالیف کا سامنا ہوتا ہے ، لیکن ایسے سفر میں بھی قصر کا حکم باقی ہوگا جس میں کوئی تکلیف اور دقت پیش نہ آئے) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ تمام مسائل میں مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے . کیونکہ وہ بھی مردوں کی طرح امور شرعیہ کی مکلفہ ہے . البتہ احرام کی حالت میں عورت سر کو ننگا نہ رکھے ، کیونکہ شریعت نے اسے سر ڈھانپنے کا حکم دے رکھا ہے . ہاں اپنا چہرہ کھلا رکھے . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ عورت کا احرام چہرے میں مؤثر ہوتا ہے (لہذا

وہ چہرہ نہ ڈھانپے) ۔

اگر عورت اپنے چہرے پر کپڑا اس طرح لٹکا دے کہ کپڑا چہرے سے متصل نہ ہو بلکہ الگ رہے تو جائز ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اسی طرح مروی ہے ۔ نیز یہ کجاوے کے سائے میں بیٹھنے کی طرح ہوگا ۔

**مسئلہ :** عورت بلند آواز سے تلبیہات نہ کہے کیونکہ اس سے کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت طواف میں رمل نہ کرے ، نیز صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی نہ کرے کیونکہ رمل اور سعی سے پردہ داری میں فرق آتا ہے ۔ اسی طرح وہ سر نہیں منڈائے گی بلکہ کچھ بال کتروائے گی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حلق کرنے سے منع فرمایا اور کتروانے کا حکم دیا ۔ نیز عورت کے لیے حلق کرنا مُثلہ کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ مردوں کے لیے داڑھی منڈوانا (مثلہ ہے ، مثلہ سے مراد فطرتی شکل و صورت میں تغیّر و تبدل کرنا ہے ۔ جیسے جنگ میں کسی مقتول کے کان اور ناک وغیرہ کاٹ لینا ۔ اسلام نے مثلہ کرنے سے منع کیا ہے) ۔

**مسئلہ :** عورت جس طرح چاہے سلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہے ۔ کیونکہ بے سلے کپڑوں کے پہننے میں پردہ دری ہے ۔

**مسئلہ :** جب حجر اسود کے پاس لوگوں کا جمگھٹا ہو تو عورت بوسہ دینے کی کوشش نہ کرے کیونکہ مردوں سے مس کرنا عورت کے لیے قطعاً ممنوع ہے . ہاں اگر مرد نہ ہوں تو حجر اسود کو بوسہ دے سکتی ہے .

**مسئلہ :** امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ جس شخص نے قربانی کے جانور کو قلادہ ڈال دیا . خواہ وہ قربانی نفل ہو یا نذر کے طور پر یا شکار کے تاوان کے طور پر یا کسی اور وجہ سے ہو ، اور حج کی نیت سے اس جانور کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑے تو وہ روانگی کے وقت ہی سے محرم ہو جائے گا . حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے جانور کو قلادہ ڈال دیا وہ محرم ہوگیا .

دوسری بات یہ ہے کہ قربانی کے جانور کو ساتھ لے کر چلنا معنوی طور پر تلبیہ کے قائم مقام ہوگا ، اور یہ اس امر کا اظہار ہوگا کہ یہ شخص حضرت ابراھیم علیہ السلام کی پکار کے جواب میں چلا ہے (یعنی حج کرنے جا رہا ہے) کیونکہ قربانی کا جانور ساتھ لے کر وہی شخص روانہ ہوتا ہے جو حج یا عمرے کا ارادہ کرلیتا ہے . اور دعاء ابراہیمی کی اجابت کا اظہار جس طرح قول (یعنی تلبیھات کہنے) سے ہوتا ہے اسی طرح فعل سے بھی ہو سکتا ہے (کہ قلادہ ڈالا ہوا جانور

ساتھ لے کر چل پڑے) لہذا روانگی کے وقت ہی محرم شمار ہوگا اور اس فعل کے ساتھ — کہ جو خصوصیت کے لحاظ سے احرام سے متعلق ہے — نیت کا اتصال بھی پایا جاتا ہے۔

قلادہ ڈالنے کی یہ صورت ہے کہ جانور کی گردن میں کسی ٹوٹے پھوٹے جوتے کا ٹکڑا کسی ٹوٹے ہوئے برتن کا دستہ یا درخت کا چھلکا (یا بٹی ہوئی رسی وغیرہ) باندھ دے۔ (قلادہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ یہ جانور قربانی کے لیے نامزد کر دیا گیا ہے اور اس سے کسی قسم کا تعرض روا نہیں)۔

**مسئلہ** : اگر کسی شخص نے جانور کو قلادہ ڈال کر (کسی دوسرے کے ہاتھ) بھیج دیا اور خود ساتھ نہ دیا تو محرم نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے قربانی کے جانوروں کے لیے قلادے گوندھتی تھی آپ ﷺ نے ان جانوروں کو بھیج دیا اور خود گھر میں غیر محرم کی حالت میں تشریف فرما رہے۔

اگر جانوروں کی روانگی کے بعد خود بھی تیار ہوگیا تو جب تک ان تک پہنچ نہ جائے محرم نہ ہوگا۔ کیونکہ روانگی کے وقت اگر جانور ساتھ نہ ہوں تو محض نیت سے محرم نہیں بن سکتا (اور مذکورہ صورت

میں جانور تو پہلے روانہ ہو چکے ہیں اور یہ شخص اب تو صرف نیت ہی کر سکتا ہے لہذا صرف نیت سے محرم نہ ہوگا) ، لیکن جب قربانی کے جانوروں تک پہنچ گیا اور ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیا ، یا ان تک ایک بار پہنچ گیا ۔ (خواہ آگے ان کے ساتھ چلے یا نہ) تو اب اس کی نیت کا اتصال ایسے عمل کے ساتھ پایا گیا جو خصوصیت کے ساتھ احرام کے متعلق ہے ، لہذا محرم بن جائے گا ۔ گویا کہ اس نے اپنے سفر کی ابتداء جانوروں کے ساتھ ہی کی تھی ۔

**مسئلہ :** امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر قربانی کا جانور متعہ کا ہو (یعنی حج تمتّع کا ارادہ ہو اور قربانی کا جانور کسی کے ہاتھ بھیج دے تو اس صورت میں) روانگی کے وقت ہی محرم شمار ہوگا (جانور تک پہنچنا شرط نہ ہوگا) ، یعنی جس وقت احرام کی نیت کرے گا اسی لمحے محرم ہو جائے گا ۔ یہ صورت استحسان کے مد نظر ہے ۔ ورنہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تک جانور تک نہ پہنچے صرف نیت کرنے سے محرم نہ ہو (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) ۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ تمتّع کے لیے قربانی کا جانور (جس کی گردن میں قلادہ ہو) مناسک حج میں سے ایک نسک کے لیے شرعی طور پر متعین ہوجاتا ہے ۔ اور یہ مکہ مکرمہ کے لیے مخصوص ہوتا ہے (یعنی اسے

وہیں پہنچ کر ذبح ہونا ہے) . اور چونکہ حج تمتع کرنے والا دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے اور یہ قربانی اس استحقاق کے شکریے کے طور پر دی جاتی ہے (لہذا ایسا شخص قربانی کے جانور تک نہ بھی پہنچ سکے تو روانگی کے وقت ہی سے محرم شمار ہوگا) . اس کے علاوہ دوسرا جانور کا ہے گا ہے تاوان کے طور پر بھی واجب ہوتا ہے اور خواہ وہ مکہ مکرمہ تک نہ بھی پہنچ سکے. (تاوان وغیرہ کا جانور تو مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے بھی ذبح کیا جا سکتا ہے ، مگر تمتع کا جانور راستے میں ذبح نہیں ہو سکتا) لہذا تمتع کے جانور کی صورت میں ، جب کہ وہ آگے بھیجا جا چکا ہو ، روانگی کے وقت ہی سے محرم بن جائے گا . اور دوسری صورتوں میں حقیقت فعل کا اعتبار ہوگا (یعنی یا تو شروع ہی سے قربانی کے جانور کے ساتھ روانہ ہو یا اگر اسے پہلے روانہ کر دیا ہے تو اس تک پہنچ جائے) .

**مسئلہ :** قربانی کے جانور پر صرف جھول ڈال دینے یا زخم کا نشان لگا دینے یا بکری کو قلادہ ڈال دینے سے محرم نہ ہوگا ، کیونکہ بعض اوقات سردی یا گرمی یا مکھیوں سے بچاؤ کے لیے بھی جھول ڈال دی جاتی ہے ، لہذا جھول ڈالنا حج کے شعائر اور علامات سے نہ ہوگا . اور جانور کو زخم سے نشان لگانا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے . لہذا إشعار

بھی قلادہ کا قائم مقام نہ ہوگا .

صاحبین؈ کا کہنا ہے کہ إشعار (یعنی زخم سے نشان لگانا) اگرچہ مکروہ تو نہیں کیونکہ جانوروں کے علاج و معالجے کے لیے بھی داغ دیا جاتا ہے اور زخم بھی لگایا جاتا ہے . (لیکن إشعار قلادہ کا قائم مقام نہ ہوگا) بخلاف قلادہ ڈالنے کے کیونکہ یہ تو قربانی کے جانور ہی سے مخصوص ہے .

رہا بکری کو قلادہ ڈالنا ، تو یہ عادت اور رسم و رواج کے خلاف ہے اور مسنون بھی نہیں (لہذا مذکورہ صورتوں میں محرم نہ ہوگا) .

**مسئلہ** : امام محمد؈ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ بدنہ (یعنی قربانی کے جانور) سے مراد اونٹ اور گائے دونوں ہیں . امام شافعی؈ فرماتے ہیں کہ بدنہ صرف اونٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے . حضور ﷺ کی حدیث جمعہ میں ارشاد ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے جلد آنے والے کی مثال بدنہ ھدیہ دینے والے کی طرح ہے (ھدیہ بمعنی قربانی دینا) اور اس کے بعد آنے والا گائے کا ھدیہ دینے والے کی طرح ہے . ملاحظہ کیجیے کہ آنحضرت ﷺ نے بدنہ اور گائے میں فرق کیا ہے . (لہذا بدنہ سے مراد صرف اونٹ ہوگا) .

احناف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ بدنہ

لغوی لحاظ سے بدانۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ضخامت اور فربہی کے ہیں . اونٹ اور گائے دونوں اس لغوی معنی میں مشترک ہیں . اسی بناء پر اونٹ اور گائے کی قربانی دیتے وقت دونوں میں سات سات حصہ دار شامل ہو سکتے ہیں .

اب آپ کی ذکر کردہ حدیث کو لیتے ہیں . اس روایت میں صحیح روایت کے مطابق بدنہ کا لفظ نہیں بلکہ "جزور" ہے . اور جزور اونٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے . آپ کی پیش کردہ حدیث آپ کے مسلک کی تائید نہیں کرتی .

وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

—:o:—

# بَابُ الْقِرَان

# قران کا بیان

**مسئلہ** : قران تمتع اور افراد دونوں سے افضل ہے . امام شافعیؒ افراد کو فوقیت دیتے ہیں اور امام مالکؒ قران پر تمتع کی افضیلت کے قائل ہیں . کیونکہ کتاب اللہ میں تمتع کا ذکر ہے (**فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ**) مگر قران کا کہیں تذکرہ نہیں .

امام شافعیؒ اپنے قول کی تائید میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : ''قران رخصت ہے''. (یعنی ترجیح تو افراد کو حاصل ہے البتہ رخصت اور رعایت کے مد نظر قران بھی کیا جا سکتا ہے . افراد کی تین صورتیں ہیں : (۱) فقط حج کرے ، (۲) صرف عمرہ کرے ، (۳) صرف حج کر کے گھر چلا جائے اور واپس آ کر عمرہ کرے . امام شافعیؒ اسی تیسرے افراد کی فوقیت کے قائل ہیں . ایک بات ذہن نشین رہے کہ امامؒ کی پیش کردہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں نہیں پائی جاتی) .

امام شافعیؒ عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ افراد کی صورت میں تلبیہات کی کثرت، سفر کی زیادتی اور حلق سے دو بار متمتع ہونے کا موقعہ ملتا ہے . ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے : "اے آل محمد ﷺ ! حج اور عمرے دونوں کا احرام اکھٹا باندھو" . نیز قران کی صورت میں جمع بین العبادتین ہے اور یہ صوم مع الإعتکاف اور نوافل کے ساتھ اللہ تعالی کی راہ میں چوکیداری اور پاسبانی کرنے کے مشابہ ہے . (آپ جانتے ہیں کہ روزے کے ساتھ ساتھ اعتکاف کا ہونا اور میدان جنگ میں رات کے وقت پاسبانی کے فرائض سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ نوافل پڑھنا بھی جمع بین العبادتین ہے اور دوہرے اجر کا موجب ہے . اسی طرح قران بھی دوہرے ثواب کے مواقع فراہم کرتا ہے یعنی ایک پتھر سے دو شکار کرنا) .

رہا تلبیہات کی کثرت کا مسئلہ تو شرع میں تلبیہات کی تعداد مقرر نہیں ، (بلکہ جس قدر چاہے کہہ سکتا ہے . اور یہ بھی ممکن ہے کہ قران کی صورت میں افراد کی صورت سے زیادہ تلبیہات کہی جائیں . یہ تو تلبیہات کہنے والے پر منحصر ہے) . اسی طرح حج سے مقصود کثرت سفر نہیں . (بلکہ سفر تو حج تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور وسائل کی کثرت مقصود اصلی کی عظمت پر منتج نہیں ہوتی) . اور حلق خروج عن العبادۃ یعنی عبادت

سے فارغ ہونے کا ذریعہ ہے . لہذا یہ وجہ ترجیح نہیں بن سکتا (جیسا کہ امام شافعیؒ نے ذکر کیا ہے) .

امام شافعیؒ کی پیش کردہ روایت کا اصل مقصد تو اہل جاہلیت کے اس قول کی نفی کرنا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا بہت قبیح برائی ہے . (حضور ﷺ کا ارشاد مشرکین کے قول کا جواب ہے کہ قران میں کوئی برائی نہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے مباح ہے) .

امام مالکؒ کے جواب میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ) قِران کا ذکر بھی کتاب اللہ میں موجود ہے . اللہ تعالی کے ارشاد گرامی : **وأتموا الحج والعمرة لله** سے مراد یہ ہے کہ اپنی جائے سکونت ہی سے ان دونوں کے لیے (اکھٹا) احرام باندھے جیسا کہ ہم اس سے پہلے (فصل مواقیت میں) بیان کر چکے ہیں .

نیز قران کی صورت میں احرام باندھنے میں عجلت درکار ہوتی ہے اور ان دونوں کا احرام میقات سے تکمیل حج و عمرہ تک باقی رہتا ہے . (یعنی قران کی صورت میں احرام کا زمانہ طویل عرصے تک رہتا ہے) مگر تمتع میں ایسا نہیں ہوتا . (کیونکہ افراد کی صورت میں عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور حج کے لیے دوبارہ احرام باندھنا ہوتا ہے) ، لہذا قِران تمتع سے افضل ہوگا .

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان بناء اختلاف یہ ہے کہ ہمارے نزدیک قارن دو طواف کرتا ہے اور دو بار سعی کرتا ہے . اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایک طواف اور ایک سعی ہوگی ، (لہذا احناف اور شوافع کے درمیان اختلاف لفظی ہوا) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں : قران کی صورت یہ ہے کہ میقات سے عمرہ و حج دونوں کے لیے اکھٹا احرام باندھے، اور احرام کی دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد یوں کہے ''اے اللہ ! میں عمرہ اور حج دونوں کی نیت کرتا ہوں اپنے فضل و کرم سے انہیں میرے لیے آسان فرما اور مجھ سے قبول فرما'' .

قران کے لغوی معنی جوڑنے اور جمع کرنے کے ہیں ''**قَرَنْتُ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ**'' میں نے ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ جوڑا اور قران میں بھی عمرہ اور حج کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا اور جمع کیا جاتا ہے .

اسی طرح اگر طواف کے چار چکروں کی تکمیل سے پہلے عمرے کے ساتھ حج کو بھی شامل کرنا چاہے (تو جائز ہے) کیونکہ ابھی تک عمرے کے طواف کا اکثر حصہ باقی ہے اور جمع کرنا ممکن ہے . جب دونوں کی ادائیگی کا عزم کرے تو اللہ تعالی سے دونوں

کی سہولت کے لیے دعاء کرے اور حج پر عمرے کی ادائیگی کو مقدم کرے.

اسی طرح تلبیہ میں بھی عمرے اور حج کو جمع کرے اور یوں کہے "لَبَّيْكَ بِعُمْرَةٍ وَحَجَّةٍ". چونکہ اسے افعال عمرہ سے ابتداء کرنا ہے اس لیے تلبیہ میں بھی عمرے کے ذکر کو مقدم کرے. اگر دعاء اور تلبیہ میں عمرے کا ذکر مؤخر بھی کر دے تو کوئی حرج نہیں. کیونکہ حرف "واو" مطلق جمع کے لیے ہے.

**مسئلہ** : اگر دل میں جمع کی نیت کرلی اور تلبیہ میں دونوں کا ذکر نہ کیا تو نماز پر قیاس کے مدنظر جائز ہوگا. (یعنی جس طرح نماز کی ادائیگی کے لیے دل کی نیت کافی ہوتی ہے. زبان سے ذکر کرنا ضروری نہیں ہوتا اسی طرح مذکورہ صورت میں بھی دل کی نیت کافی ہوگی).

**مسئلہ** : جب مکہ مکرمہ میں داخل ہو تو بیت اللہ کے گرد سات چکر لگا کر طواف کرے. پہلے تین چکروں میں رمل کرے اور طواف سے فارغ ہو کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے یہ افعال عمرہ ہیں. بعد ازاں افعال حج کی ابتداء کرے اور طواف قدوم کے سلسلے میں سات چکر لگا کر طواف کرے اور

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے جیسا کہ ہم مفرد کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں .

**مسئلہ** : عمرہ کے افعال کو افعال حج پر مقدم کرے ، اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **"فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ"** (یعنی جو شخص حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اٹھائے . دیکھیے اس آیت میں عمرہ کو حج پر مقدم کیا گیا ہے . نیز مذکورہ آیت میں "إلی" استعمال ہوا ہے . إلی کا ماقبل اپنے مابعد سے رتبہ میں بھی مقدم ہوتا ہے). اور قِران بھی معنوی لحاظ سے تمتع ہی ہے .

**مسئلہ** : عمرہ اور حج کے درمیانی عرصے میں حلق نہ کرے کیونکہ حج کے احرام کے ہوتے ہوئے حلق کرنا جنایت شمار ہوتا ہے . بلکہ قارن بھی مفرد کی طرح نحر کے دن حلق کرے . ہمارے نزدیک قارن بھی مفرد کی طرح حلق کی بناء پر ہی احرام سے نکلے گا نہ کہ ذبح سے .

قران کے مذکورہ بالا مسائل مسلک احناف کے مطابق ہیں . امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ (عمرہ اور حج دونوں کے لیے) ایک طواف اور ایک سعی کرے . حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن تک عمرہ حج میں داخل ہوگیا ہے . دوسری بات یہ ہے کہ قِران کا دار و مدار تداخل پر ہوتا ہے (یعنی

ایک عبادت دوسری عبادت میں داخل اور شامل ہو جاتی ہے) کیا آپ دیکھتے نہیں کہ قران میں ایک ہی تلبیہ ایک ہی سفر اور ایک ہی حلق پر اکتفاء کیا جاتا ہے. اسی طرح ارکان کا دار و مدار بھی تداخل پر ہوگا. (کہ ایک کے ارکان دوسرے میں داخل ہو جائیں گے لہذا ایک طواف اور ایک سعی دونوں کے لیے کافی ہوگی).

ہماری دلیل یہ ہے کہ جب حضرت صبی بن معبد نے دو طواف کیے اور دو بار سعی کی تو حضرت عمرؓ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو اپنے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی توفیق میسر آئی ہے. دوسری بات یہ ہے کہ قران نام ہے ایک عبادت کو دوسری عبادت کے ساتھ جوڑنے اور جمع کرنے کا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ہر عبادت کے اعمال کامل طور پر ادا کیے جائیں. تیسری بات یہ ہے کہ عبادات مقصودہ میں اس طرح تداخل نہیں ہوتا (کہ ایک کے اعمال دوسرے میں داخل ہو کر سرے سے ساقط ہو جائیں) رہا سفر، تلبیہ اور حلق کا معاملہ تو ان میں تداخل ممکن ہے کیونکہ یہ امور مقصود حقیقی نہیں (بلکہ مقصود کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع ہیں) سفر حج تک رسائی کا وسیلہ ہے. تلبیہ تحریم (یعنی احرام باندھنے) کا سبب ہے اور حلق تحلیل (یعنی احرام

دھولنے) کا ذریعہ ہے . (چونکہ یہ امور وسائل کا درجہ رکھتے ہیں ان میں تداخل ممکن ہے) لیکن ارکان کی حیثیت ان سے مختلف ہے (لہذا ان میں تداخل بھی ممکن نہیں) . اس کی ایک واضح مثال ملاحظہ کیجیے . کہ نفل کے دو شفعوں کو ایک ہی تحریمہ سے ادا کیا جاتا ہے مگر ان میں تداخل نہیں ہوتا . (یعنی ایک شخص چار رکعت نفل کی نیت کرتا ہے ہر شفع الگ عبادت ہے ان میں قران کیا گیا اور ایک ہی تکبیر تحریمہ سے ان کی ابتداء کی گئی تو اب یہ ممکن نہیں کہ دوسرے شفع کے رکوع و سجود پہلے شفع کے رکوع و سجود میں داخل ہو جائیں . بلکہ دوسرے شفعے کے رکوع و سجود اور دیگر ارکان کو الگ کامل طور پر ادا کرنا ہوگا . لہذا ثابت ہوا کہ ارکان میں تداخل نہیں ہوتا) .

آپ کی پیش کردہ حدیث "دَخَلَتِ العمرہُ فِي الحَجّ" کا مطلب دَخَلَ وَقْتُ الْعُمْرَةِ فِي وَقْتِ الْحَجّ ہے (یعنی حدیث کی عبارت میں مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے . نیز یہ حدیث فی الحقیقۃ مشرکین کے اس قول باطل ، کہ حج کے ایام میں عمرہ گناہ ہے ، کا جواب ہے . لہذا اس سے آپ کے مسلک کی تائید ممکن نہیں) .

مسئلہ : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے عمرہ اور حج دونوں کے لیے دو بار طواف کیا اور پھر دونوں کے لیے دو بار سعی کی تو جائز ہوگا . کیونکہ (قران کی بناء پر) جو افعال اس پر واجب تھے وہ ان کی ادائیگی سے سبکدوش ہوگیا . البتہ عمرہ کی سعی میں تأخیر اور طواف تحیہ کی تقدیم کی بناء پر گناہگار ہوگا ، لیکن اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا .

صاحبینؒ کے اصول کے مطابق تو یہ واضح ہے . کیونکہ ان کے نزدیک مناسک کی تقدیم یا تأخیر سے دم لازم نہیں آتا . امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طواف تحیہ سنت ہے . اور مسنون امر کے ترک پر دم لازم نہیں آتا ، اور طواف کی تقدیم سے بطریق اولی دم واجب نہ ہوگا .

اگر سعی میں کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے تأخیر ہو جائے (مثلاً طواف کے بعد کھانا کھانے لگے ، یا مستانے کے لیے لیٹے اور سو جائے) تو دم واجب نہ ہوگا ، اور طواف میں مشغول ہو جانے کی بناء پر تو بطریق اولی واجب نہ ہوگا .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جب نحر کے دن جمرہ پر رمی سے فارغ ہو جائے تو ایک بکری یا گائے یا اونٹ ذبح کرے یا گائے یا اونٹ کے ساتویں حصے میں شراکت کرلے . یہ دم قران کہلاتا

ہے ۔ چونکہ قران بھی معنوی لحاظ سے تمتع ہے اور تمتع کی صورت میں قربانی دینے کا حکم نص قرآنی میں موجود ہے : (فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ : اور جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے وہ حسب مقدور قربانی دے) . ھدی یعنی قربانی کے جانور سے مراد اونٹ ، گائے اور بکری ہے ۔ اس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ ہم "باب الھدی" میں بیان کریں گے ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ متن میں بدنہ سے مراد اونٹ ہے ۔ اگرچہ لفظ بدنہ گائے اور اونٹ دونوں پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، (مگر یہاں بدنہ کے مقابلے میں بقر ہے اس لیے بدنہ سے مراد اونٹ ہے) ۔

حدیث جابرؓ کے پیش نظر جس طرح اونٹ کی قربانی میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں اسی طرح گائے میں بھی سات افراد شراکت کر سکتے ہیں ۔ (حضرت جابرؓ سے مروی ہے : اشترکنا حین کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی البقرة سبعة وفی البدنة سبعة) ۔

مسئلہ : اگر ذبح کے لیے قربانی کا جانور میسر نہ آ سکے (مثلاً جانور دستیاب ہی نہ ہو یا خریدنے کی استطاعت نہ ہو) تو ایام حج کے دوران تین روزے اس

طرح رکھے کہ آخری یعنی تیسرا روزہ عرفے کے دن ہو ، (یعنی سات آٹھ اور نو تاریخ کے روزے رکھے) .

اور جب حج سے فارغ ہو کر اپنے گھر اہل و عیال میں پہنچ جائے تو سات روزے رکھے . اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر ، اس طرح پورے دس روزے رکھ لے .

نص قرآنی میں اگرچہ تمتع کا حکم مذکور ہے لیکن قران بھی معنوی لحاظ سے تمتع ہی ہے (یعنی قران میں تمتع کا معنی موجود ہے) ، کیونکہ قران میں بھی دو قسم کے مناسک سے انتفاع حاصل کیا جاتا ہے ، (یعنی جس طرح انسان تمتع میں دو مناسک عمرہ اور حج سے مستفیض ہوتا ہے اسی طرح قران میں بھی دونوں مناسک یعنی عمرہ اور حج سے بہرہ ور ہوتا ہے) .

"فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ" میں حج سے مراد نفس حج نہیں بلکہ حج کا وقت مراد ہے . کیونکہ نفس حج میں ظرف بننے کی صلاحیت نہیں (یعنی مذکورہ آیت میں حرف "فی" برائے ظرفیت ہے لیکن حج مظروف نہیں بن سکتا ، کیونکہ حج نام ہے چند افعال کے مجموعے کا اور ایک فعل یعنی حج دوسرے فعل یعنی صوم کے لیے ظرف نہیں بن سکتا . اس لیے حج سے مراد وقت حج ہے) .

البتہ افضل یہ ہے کہ یوم ترویہ سے ایک روز پہلے ، ترویہ کے دن اور عرفہ کے دن روزے رکھے (یعنی سات ، آٹھ اور نو ذی الحجہ کو) ، کیونکہ روزہ ھدی (قربانی) کا بدل ہے ؛ اور ممکن ہے کہ قربانی کا جانور (وقت سے پہلے) میسر آ جائے . لہذا روزوں کے لیے آخر وقت تک تأخیر کرنا مستحسن ہوگا (یعنی مذکورہ ایام سے پہلے نہ رکھے) .

مسئلہ : اگر حج سے فارغ ہونے کے بعد قیام مکہ کے دوران ہی سات روزے رکھ لے تو جائز ہے . البتہ ایام تشریق (یعنی گیارھویں ، بارھویں اور تیرھویں ذی الحجہ) کے بعد رکھے ؛ کیونکہ ایام تشریق میں روزہ رکھنا شرعاً ممنوع ہے .

امام شافعیؒ جواز کے قائل نہیں . وہ فرماتے ہیں کہ یہ سات روزے گھر پہنچ جانے کے ساتھ مشروط ہیں . ہاں اگر مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کرے تو وہاں روزے رکھ سکتا ہے . کیونکہ اب رجوع (یعنی گھر لوٹ کر جانے) کی صورت باقی نہ رہی . احناف کہتے ہیں کہ ارشاد الہی میں اِذَا رَجَعْتُمْ کا مطلب اِذَا رَجَعْتُمْ عَنِ الْحَجِّ ہے اور رَجَعْتُمْ کے معنی فَرَغْتُمْ ہیں ، (یعنی جب تم حج سے فراغت حاصل کر لو تو سات روزے رکھ لو) کیونکہ حج سے فراغت ہی گھر کی

طرف رجوع کا سبب ہوتی ہے . اور مذکورہ صورت میں روزوں کی ادا چونکہ سبب کے متحقق ہونے کے بعد پائی گئی لہذا جائز ہوگی .

**مسئلہ** : اگر مذکورہ تین ایام میں روزے نہ رکھ سکا اور نحر کا دن آگیا تو اب سوائے قربانی کے اور کچھ بھی جائز نہ ہوگا ، (یعنی اب اسے بہر صورت جانور قربان کرنا ہوگا خواہ اسے قرض لے کر ہی خریدنا پڑے) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان ایام کے گزر جانے کے بعد بھی روزے رکھ سکتا ہے . کیونکہ (نص قرآنی کے مد نظر) ان کا وقت معین اور مقرر ہے . اس لیے ان کی قضاء ہو سکتی ہے . جیسا کہ صیام رمضان (چونکہ صیام رمضان کا وقت بھی مقرر ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ماہ رمضان میں روزے نہ رکھ سکے تو بعد میں ان کی قضاء ہو سکتی ہے) .

امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ ایام تشریق میں بھی رکھ سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ** . اور یہ تین دن یعنی ایام تشریق بھی حج کے اوقات ہی شمار ہوتے ہیں .

احناف امام مالکؒ کے جواب میں کہتے ہیں کہ ان ایام میں روزے کی ممانعت حدیث مشہور سے ثابت

ہے . لہذا نص قرآنی کو حدیث مشہور کی بناء پر مقید کیا جائے گا (**فمن لم یجد فصیام ثلاثة ایام فی الحج غیر ایام التشریق**) . نیز اگر نص کو مقید نہ کریں تو حدیث مشہور کی بناء پر ان ایام کے روزوں میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور لازم آئے گا . پس جو روزے کامل طور پر واجب ہوئے ہیں ان کی قضاء ناقص اوقات میں درست نہ ہوگی . (یعنی اگر حدیث مشہور سے نص کو مقید نہ کریں تو آپ کا مقصد ثابت ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ حدیث سے ان ایام کے روزوں کی ممانعت ثابت ہے . اگر ممانعت کے باوجود ان ایام میں روزے رکھ لے تو ان میں کسی نہ کسی نوع کی کمی اور نقص پایا جائے گا ، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ جو چیز کامل طور پر واجب فی الذمہ ہوئی اسے ناقص طور پر ادا کیا گیا . علماء اصول کے نزدیک یہ جائز نہیں) .

امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب دیتے ہوئے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ایام تشریق کے بعد بھی قضاء نہ کرے . کیونکہ صوم (قربانی کے جانور کا) بدل ہے اور (یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ) شرعی اجازت اور راہنمائی کے بغیر ہم اپنے طور پر کسی چیز کو کسی دوسری چیز کا بدل نہیں بنا سکتے ؛ اور اس مختلف فیہ صورت میں شریعت نے صیام کو اوقات حج کے ساتھ مقید کیا ہے . (لہذا ہم اپنی مرضی سے کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے

کہ اوقات حج کے بعد روزے رکھ لیں) تو ہم نے اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے دم یعنی قربانی کو لازم قرار دیا . (کیونکہ اصل چیز تو قربانی ہے) .

نیز مذکورہ صورت میں (کہ جب قارن کو جانور بھی میسر نہ آئے اور تین روزے بھی نہ رکھے حتی کہ ایام تشریق آ جائیں) حضرت عمرؓ نے بکری ذبح کرنے کا حکم دیا تھا .

**مسئلہ** : اگر قارن کو ھدی یعنی قربانی میسر نہ آئے تو احرام کھول دے لیکن اس کے ذمے دو دم ہوں گے . ایک دم تمتع اور دوسرا دم تحلل . کیونکہ اس نے قربانی سے پہلے احرام کھولا ہے .

**مسئلہ** : اگر قارن مکہ مکرمہ داخل ہوئے بغیر میدان عرفات کی طرف روانہ ہو جائے اور وہاں پہنچ کر وقوف کرلے تو وہ تارک عمرہ ہوگا (یعنی اس کا عمرہ جاتا رہا ، حالیکہ قارن کو پہلے عمرہ کرنا ہوتا ہے) ، کیونکہ اب اس کے لیے عمرے کے افعال کی ادائیگی ممکن نہیں رہی . (اگر وقوف عرفات کے بعد عمرہ کرنا چاہے تو یہ بھی مناسب نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ) افعال حج پر افعال عمرہ کی بناء کرنے والا ہوگا ، اور یہ خلاف مشروع ہے . (مشروع صورت تو یہ تھی کہ افعال عمرہ پر افعال حج کی بناء کرتا) .

**مسئلہ** : اور مطلق توجہ سے تارک عمرہ شمار نہ ہوگا . امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی یہی بات صحیح ہے . اس شخص کے اور جمعہ کے دن ظہر پڑھنے والے کے درمیان فرق یہ ہے کہ جب وہ نماز جمعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو امر (**فاسعوا إلى ذكر الله**) کی طرف ظہر کی ادائیگی کے بعد متوجہ ہو رہا ہے . مگر قران اور تمتع میں اداء عمرہ سے پہلے حج کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہونا ممنوع ہے . پس دونوں میں فرق واضح ہوگیا .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے دم قران ساقط ہو جائے گا . کیونکہ جب اس نے عمرے کو ترک کر دیا تو اس نے دو نسک کی ادائیگی سے انتفاع حاصل نہ کیا . اور چونکہ اس نے عمرہ کو شروع کرکے ترک کیا ہے لہذا اس پر دم واجب ہوگا اور عمرہ کی قضاء بھی لازم ہوگی . کیونکہ عمرہ کا شروع کرنا صحیح تھا . (اور اس نے ایک ایسے امر کو جس کی ابتداء صحیح تھی شروع کرکے ترک کر دیا) پس یہ محصر کے مشابہ ہوگا . (اور محصر پر بھی ترک کی بناء پر دم واجب ہوتا ہے) .

**واللہ اَعْلَمُ**

## بَابُ التَّمَتُّعْ

# تمتّع کا بیان

مسئلہ: تمتع افراد سے افضل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ افراد کی افضلیت کے قائل ہیں (امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے)۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ متمتع کے سفر کا (اولین) مقصد عمرہ ہوتا ہے اور مفرد کے سفر کا مقصد حج۔ (حج فرض ہے اور عمرہ سنت، لہذا جو سفر فرض کی ادائیگی کے لیے واقع ہوگا وہ یقیناً افضل ہوگا)۔

ظاہرالروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ تمتع کی صورت میں دو عبادتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ پس یہ قران کے مشابہ ہوگا۔ نیز تمتع میں (صرف حج کی بنسبت) مناسک بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً قربانی دینا (دو بار طواف کرنا دو بار سعی کرنا وغیرہ) اور متمتع کا سفر بھی حج کے لیے ہوتا ہے۔ اگرچہ درمیان میں عمرہ آ جاتا ہے مگر عمرہ حج کے تابع شمار ہوتا ہے۔ (لہذا تابع چیز کے درمیان میں آنے سے متبوع میں کسی قسم کا خلل ظہور پذیر نہیں ہوتا) جیسا کہ سنتیں نماز جمعہ اور سعی الی الجمعۃ کے درمیان آتی ہیں (اور سنتیں نماز جمعہ

کے تابع ہیں اس لیے ان کے درمیان آنے سے کوئی خلل یا نقصان وقوع پذیر نہ ہوگا) .

مسئلہ : متمتع کی دو قسمیں ہیں . ایک وہ متمتع جو ھدی یعنی قربانی کا جانور ساتھ لے کر چلتا ہے اور دوسرا وہ جو ھدی ساتھ لے کر نہیں چلتا . اور تمتع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک ہی سفر میں دو نسک (یعنی عمرہ و حج) کی ادائیگی سے بہرہ ور ہو . بشرطیکہ ان دو مناسک کے درمیانی عرصے میں اپنے گھر اور اہل و عیال میں المام صحیح میں بہرہ یاب نہ ہو . اس مسئلے میں کئی اختلافات ہیں جنھیں ہم ان شاء اللہ اسی باب میں تفصیل سے بیان کریں گے . (اس مسئلے کی مندرجہ ذیل تین اہم صورتیں ہیں : اول یہ کہ ایک شخص ھدی لے کر مکہ مکرمہ گیا ، عمرہ ادا کرکے گھر آگیا اور پھر حج کے لیے روانہ ہوا ، تو یہ شخص متمتع ہوگا . کیونکہ اس کا المام (یعنی گھر کو مراجعت اور آمد) المام صحیح نہیں ، ابھی تو اسے حج کرنا ہے اور مکہ مکرمہ لوٹ کر جانا ہے . لہذا اس کی حالت احرام باقی ہے .

دوم یہ کہ ھدی ساتھ لے کر نہ جائے اور عمرہ کرکے گھر لوٹ آئے تو اس صورت میں متمتع نہ ہوگا . کیونکہ اس کا المام صحیح ہے . یعنی اس کی حالت احرام والی صفت باقی نہیں رہی بلکہ وہ احرام کھول سکتا ہے .

سوم یہ کہ ھدی ساتھ لے کر نہ جائے لیکن عمرہ سے فراغت کے بعد گھر نہ لوٹے بلکہ مکہ مکرمہ میں حج تک مقیم رہے تو یہ بھی متمتع ہوگا۔

مذکورہ صورتوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ اگر گھر ایسی حالت میں لوٹے کہ احرام کھول سکتا ہو تو اسے المام صحیح کہا جاتا ہے یعنی اس کی گھر میں آمد کامل طور پر ہے، اور اگر احرام کا کھولنا مباح نہ ہو تو اسے المام فاسد یا ناقص کہتے ہیں۔ نہایہ شرح ھدایہ میں المام کی تشریح یوں کی گئی ہے: **اَلْالمامُ لغةً النزولُ يقال اَلَمَّ بأهله أى نزل والالمام الصحيح عبارة عن النزول فى وطنه من غير بقاء صفة الاحرام هذا انما يكون فى المتمتع اذا لم يسق الهدى. واما اذا ساق الهدى فالمامه لا يكون صحيحاً)**۔

**مسئلہ:** تمتع کی صورت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں میقات سے عمرے کے لیے احرام باندھے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر طواف، سعی اور حلق یا قصر کرے تو اسے عمرے کے احرام سے تحلل حاصل ہو گیا (یعنی اب وہ احرام کھول سکتا ہے)۔ امام قدوریؒ کا یہ بیان عمرہ کی توضیح ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ حلق یا قصر نہ کرے کیونکہ عمرہ نام ہے (صرف) طواف اور سعی کا۔ ہماری پیش کردہ حدیث امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے۔

نیز اللہ تعالی کا یہ ارشاد ”لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُؤُسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ“: (إن شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤگے) عمرۂ قضاء کے سلسلے میں نازل ہوا تھا . دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان (احرام باندھ کر) تلبیہات کہنے سے عمرے کے لیے محرم ہو جاتا ہے تو سر منڈوانے سے عمرے کے حق میں تحلل بھی حاصل ہو سکتا ہے ، جیسا کہ حج میں (تلبیہات سے تحرم اور حلق سے تحلل ہو جاتا ہے . یعنی جس طرح احرام اور تلبیہات عمرے کی ابتداء کا پتا دیتے ہیں ، اسی طرح سر منڈوانا عمرے کی تکمیل کی علامت ہے اور حج میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے) .

مسئلہ : جب طواف شروع کرے تو تلبیہات کہنا ختم کر دے . امام مالکؒ کا قول ہے کہ جونہی بیت اللہ پر نظر پڑے (تلبیہات ختم کر دے) کیونکہ عمرہ نام ہے زیارت بیت اللہ کا اور بیت اللہ (کی دید اور طواف) سے عمرے کی تکمیل ہو جاتی ہے .

ہمارے مسلک کی تائید امام ترمذیؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمرۂ قضاء کے دوران حجر اسود کے استلام کے وقت تلبیہات ختم کر دیں . نیز چونکہ عمرہ سے مقصد طواف بیت اللہ ہے . اس لیے

طواف کا افتتاح کرتے وقت تلبیهات ختم کر دی جائیں۔
اسی وجہ سے حج کرنے والا رمی کا افتتاح کرتے ہوئے
تلبیهات ختم کر دیتا ہے ۔

**مسئلہ :** امام قدوری فرماتے ہیں کہ (عمرے سے
فارغ ہو کر) مکہ مکرمہ میں تحلل کی حالت میں (یعنی
احرام کے بغیر) اقامت کرے ۔ کیونکہ اسے عمرہ سے
تحلل حاصل ہو چکا ہے (یعنی عمرے کی ادائیگی کے بعد
احرام کھول دیا جائے) ۔

ترویہ کے دن مسجد حرام سے حج کا احرام باندھے۔
شرط یہ ہے کہ حرم کی حدود میں احرام باندھے ، مسجد
سے احرام باندھنا ضروری نہیں ۔ کیونکہ معنوی لحاظ
سے اس شخص کی حیثیت مقامی آدمی یعنی مکی کی سی
ہے اور مکی آدمی کا میقات حرم ہے جیسا کہ ہم باب
المواقیت میں بیان کر چکے ہیں ۔

حج مفرد کرنے والے کی طرح افعال حج کو ادا
کرے کیونکہ اب افعال حج کی ادائیگی شروع ہو رہی
ہے ۔ البتہ اتنا فرق ہوگا کہ طواف زیارت میں رمل
کرے اور اس کے بعد سعی ۔ کیونکہ حج کے سلسلے
میں اس کا یہ پہلا طواف ہے ۔ بخلاف مفرد کے کہ وہ
ایک بار سعی کر چکا ہے ۔

**مسئلہ :** اگر متمتع حج کا احرام باندھنے کے بعد

اور منی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے طواف اور سعی کر چکا ہو ، تو طواف زیارت میں رمل نہ کرے اور نہ اس کے بعد سعی ۔ کیونکہ ایک بار رمل اور سعی کر چکا ہے اور مذکورہ بالا نص (فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی) کے پیش نظر اس پر دم تمتع واجب ہوگا ۔

اگر قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر رکھ لے ۔ اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔ اگر ماہ شوال میں تین روزے رکھے اور بعد میں عمرے کے لیے احرام باندھے (لیکن قربانی کا جانور میسر نہ آئے) تو شوال کے مذکورہ تین روزے ان تین روزوں (جو قربانی میسر نہ آنے کی صورت میں رکھنے ہوتے ہیں) کے قائم مقام نہ ہوں گے ۔ کیونکہ روزوں کے وجوب کا سبب تمتع ہے اور یہ روزے قربانی کے جانور کا بدل ہیں ۔ مگر وہ ماہ شوال میں احرام باندھنے سے متمتع نہیں ہو سکتا ۔ (کیونکہ تمتع کے لیے اس امر کی شرط ہے ۔ کہ حج کے زمانے میں عمرے کے لیے احرام باندھا جائے) لہذا سبب کے موجود ہونے سے قبل ہی ان روزوں کی ادائیگی جائز نہ ہوگی ۔

اگر عمرہ کا احرام باندھ کر طواف کرنے سے پہلے روزے رکھ لیے تو ہمارے نزدیک جائز ہوں گے ۔

امام شافعیؒ عدم جواز کے قائل ہیں وہ دلیل کے طور پر اللہ تعالی کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں: **"فصیام ثلاثة أيام فی الحج"**. (چونکہ نص میں روزوں کو ایام حج سے مقید کیا گیا ہے اس لیے احرام حج کے بعد ہی جائز ہوں گے).

احناف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس نے وجود سبب کے بعد روزے رکھے ہیں (اس لیے جائز ہوں گے)، اور نص میں حج سے مراد وقت حج ہے. جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں (کہ نفس حج ظرف نہیں بن سکتا)، اور مستحسن یہ ہے کہ ان روزوں کو آخر وقت یعنی یوم عرفہ تک مؤخر کرے جیسا کہ ہم قِران کے باب میں ذکر کر چکے ہیں. (یعنی اس بناء پر مؤخر کرے کہ شاید اسے قربانی کا جانور میسر آ جائے. اصل کی ادائیگی پر قادر ہو جائے اور بدل کی ضرورت ہی در پیش نہ آئے).

**مسئلہ**: متمتع اگر قربانی کا جانور ساتھ لے جانا چاہتا ہو تو (عمرے کا احرام باندھ لے اور جانور کو ساتھ لے کر چل پڑے. یہی مناسب صورت ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ بنفس نفیس قربانی کے جانوروں کو ساتھ لے کر چل پڑے تھے. نیز یہ (یعنی قربانی کے جانور ساتھ لے کر چلنا) سفر حج کی تیاری اور اس کے لیے تعجیل کی بہترین صورت ہے.

اگر قربانی کا جانور بدنہ (یعنی اونٹ یا گائے) ہو تو اس کے گلے میں چمڑے کا ٹکڑا یا ٹوٹا ہوا جوتا قلادے کے طور پر ڈال دے. اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کی روایت بیان کی جا چکی ہے.

**مسئلہ** : جانور پر جھول ڈال دینے کی بنسبت قلادہ ڈالنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ قلادے کا تذکرہ تو کتاب اللہ میں بھی موجود ہے. (**جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰماً لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ.** یعنی اللہ تعالی نے مکان محترم، کعبہ لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی اس کام میں معاون بنا دیا).

نیز قلادہ لوگوں کو جتلانے کا (کہ یہ قربانی کا جانور ہے) بہترین ذریعہ ہے. لیکن جھول تو زیب و زینت اور حرارت و برودت سے بچاؤ کے لیے بھی ڈالی جاتی ہے. (لہذا جھول ڈالنا اعلام کا مناسب ذریعہ نہیں).

تلبیہ کہہ کر قلادہ ڈالے کیونکہ ھدی کو قلادہ ڈالنے اور ساتھ لے کر چلنے سے وہ محرم ہو جائے گا. جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں. بہتر تو یہ ہے کہ تلبیہ کہتے ہوئے احرام باندھے (اور پھر جانور کو قلادہ ڈالے).

**مسئلہ**: قربانی کے جانور کو ہانک کر لے جانا کھینچ کر لے جانے سے افضل ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے مقام ذی الحلیفہ پر احرام باندھا تھا۔ درآنحالیکہ قربانی کے جانوروں کو آگے آگے ہانکا جا رہا تھا۔ نیز اس صورت میں دوسروں کو جتلانے میں بھی سہولت ہے (یعنی لوگ جان لیں گے کہ یہ ھدایا ہیں اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں گے) البتہ اگر جانور ہانکنے سے نہ چلتا ہو تو اس صورت میں اسے رسی ڈال کر آگے سے کھینچا جا سکتا ہے۔

**مسئلہ** : امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ بدنہ کو إشعار کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ إشعار کے قائل نہیں۔ اشعار یہ ہے کہ جانور کو زخم لگا کر خون آلود کر دیا جائے۔ اشعار کی بہتر صورت یہ ہے کہ اونٹ کی کوہان کی دائیں جانب نچلے حصے پر نیزے سے زخم لگایا جائے۔

علماء متأخرین کا قول ہے کہ کوہان کی بائیں جانب إشعار کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ حضور ﷺ نے قصداً بائیں جانب نیزہ مارا اور دائیں جانب اتفاقاً لگ گیا تھا اور لوگوں کو جتلانے کے لیے (کہ یہ قربانی کے جانور ہیں) کوہان کو خون آلود کردے۔

یہ فعل یعنی اشعار امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ مگر صاحبینؒ کے نزدیک مستحسن ہے اور

امام شافعیؒ کے نزدیک سنت . وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین سے اسی طرح مروی ہے .

صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ قربانی کے جانوروں کو قلادہ ڈالنے کا اصل مقصد لوگوں کو جتلانا ہے (کہ یہ قربانی کے جانور ہیں) تاکہ وہ انہیں پانی سے یا کسی چراگاہ میں گھاس چرنے سے منع نہ کریں یا اگر کوئی جانور کہیں کھو جائے تو اسے لوٹا دیا جائے اور یہ مقصد إشعار سے بطریق اولی حاصل ہوتا ہے . (کیونکہ قلادہ یعنی چمڑے کا ٹکڑا وغیرہ تو گردن سے گر بھی سکتا ہے مگر) إشعار یعنی زخم بحال رہتا ہے ان مقاصد اور فوائد کے مد نظر اشعار کو سنت ہونا چاہیے مگر دوسری طرف مثلہ کرنے کا مسئلہ در پیش ہے . اس لیے ہم نے اسے حسن کہنے پر اکتفاء کیا .

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اشعار میں مُثلہ کرنا لازم آتا ہے اور مثلہ کرنا قطعاً ممنوع ہے اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب امر مباح اور ممنوع میں تعارض ہو تو ترجیح ممنوع کو ہوتی ہے (مذکورہ صورت میں اشعار کی سنّیة اور مثلہ کی ممنوعیة میں تعارض تھا . لہذا جانب ممنوعیة کو ترجیح دی گئی) رہا حضور ﷺ کے اشعار کرنے کا معاملہ . تو آپ ﷺ نے ھدایا کو مشرکین سے بچانے کے لیے ایسا کیا تھا . کیونکہ

مشرکین صرف إشعار کی صورت میں ھدایا سے تعرض نہ کرتے (قلادے کی صورت میں ان سے بچاؤ ممکن نہ ہوتا).

کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے دور کے لوگوں کو اشعار سے منع فرمایا تھا کیونکہ وہ لوگ اشعار سے اس قدر گہرا زخم لگا دیتے کہ زخم سے پیپ رسنے لگتی (اور بعض اوقات مر بھی جاتے تھے) . بعض علماء نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ اشعار کو تقلید (یعنی قلادہ ڈالنے) پر ترجیح دینے کو مکروہ جانتے تھے. (یعنی کراہت ترجیح میں تھی جواز یا عدم جواز کا سوال نہ تھا) .

**مسئلہ** : جب مکہ مکرمہ میں داخل ہو تو طواف اور سعی کرے . یہ طواف اور سعی عمرے کے لیے ہوگی . جیسا کہ ہم اس متمتع کے بارے میں بیان کر چکے ہیں جو جانور ساتھ لے کر نہیں آتا . البتہ یوم الترویہ تک اسے تحلل حاصل نہ ہوگا (یعنی احرام نہ کھول سکے گا) اور ترویہ کے دن اسے حج کا احرام باندھنا ہوگا . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر ان معاملات کا مجھے پہلے علم ہوتا جن کا پتا اب بعد میں چلا ہے تو میں قربانی کا جانور ساتھ لے کر نہ آتا اس (حج) کو عمرہ بنا دیتا اور احرام کھول دیتا . اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ جب جانور ساتھ لایا جائے تو (عمرہ کے بعد) احرام نہیں کھولا جا سکتا .

(نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں قران کیا تھا اور قربانی کا جانور ساتھ لے کر تشریف لائے تھے. صحابہ کرام ہدایا نہیں لائے تھے. جب عمرہ سے فارغ ہوگئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رض سے فرمایا کہ احرام کھول دو. صحابہ رض میں اضطراب پیدا ہوا کہ حضور ﷺ خود احرام باندھے ہوئے ہیں، شاید ہمارے لیے بھی نہ کھولنا بہتر ہو تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے پہلے علم ہوتا کہ ہدی ساتھ لے کر جانا احرام کھولنے سے مانع ہے تو میں بھی ہدی ساتھ لے کر نہ آتا اور اسے عمرے میں بدل دیتا اور احرام کھول دیتا. مگر اب حکم الہی کی آمد سے مجھے پتا چلا ہے کہ سوق ہدی کی صورت میں احرام نہیں کھولا جا سکتا).

**مسئلہ** : ترویہ کے دن اہل مکہ کی طرح احرام باندھے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اگر یوم الترویہ سے پہلے ہی احرام باندھ لے تو بھی جائز ہے اور متمتع جس قدر پہلے اور جلد احرام باندھ لے گا اسی قدر افضل اور باعث اجر ہوگا. کیونکہ اس میں خیر کی طرف جلد اقدام ہوتا ہے نیز مشقت بھی افزوں ہے (کیونکہ احرام باندھ لینے سے کئی قسم کی پابندیاں عاید ہوجاتی ہیں). فضیلت کی یہ صورت ہر اس شخص کے لیے جو ہدی ساتھ لے کر آئے یا بغیر ہدی کے آئے برابر ہے اور اس پر دم واجب ہوگا. جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ دم تمتع ہے.

مسئلہ : یوم نحر کو جب سر منڈوا لے گا تو اسے دونوں احراموں سے تحلل حاصل ہوجائے گا. کیونکہ سر کا منڈوانا حج میں اسی طرح محلل ہے جس طرح سلام نماز میں. لہذا حلق دونوں احراموں کے محلل ہوگا.

مسئلہ : اہل مکہ نہ تو قران کر سکتے ہیں اور نہ تمتع . ان کے لیے صرف إفراد ہی باقی رہ جاتا ہے. امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے. (وہ فرماتے ہیں کہ قران بھی کر سکتے ہیں اور تمتع بھی ، البتہ ان پر دم لازم نہ ہوگا) .

اللہ تعالی کا ارشاد ذٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یعنی یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجد حرام کے قریب نہ ہوں) امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے . دوسری بات یہ ہے کہ قران اور تمتع اس لیے مشروع ہیں کہ دو بار سفر کرنے کی بجائے ایک ہی سفر میں دو فائدے حاصل ہو سکیں اور یہ صورت باہر سے آنے والوں کے لیے ہے . (کیونکہ اہل مکہ کے لیے ایسی کوئی مجبوری نہیں وہ تو جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں) .

مسئلہ : اور جو شخص مواقیت کے اندر سکونت پذیر ہو اس کی حیثیت بھی اہل مکہ کی سی ہوگی یہ لوگ نہ قران کر سکیں گے اور نہ تمتّع . بخلاف اس

صورت کے کہ جب کوئی مکی شخص کہیں باہر مثلاً کوفہ کی طرف نکل جائے تو قران کر سکتا ہے کیونکہ اب عمرہ اور حج کے لیے باہر سے آنے والے کی طرح دو میقات ہوں گے اور وہ بھی باہر سے آنے والے کی طرح ہوگا. اس لیے اس کا قران درست ہوگا. (مصنفؒ نے صرف قران کا اس بناء پر ذکر کیا ہے کہ مکی شخص باہر آ کر بھی تمتع نہیں کر سکتا. کیونکہ تمتع میں یہ شرط ہے کہ دو نسک کے درمیان گھر میں المام صحیح نہ ہو اور مکی کے لیے یہ ممکن نہیں کیونکہ مکہ مکرمہ میں اس کا المام صحیح ہوگا).

مسئلہ: اگر متمتع اپنے ساتھ قربانی کا جانور لے کر نہ گیا ہو اور عمرہ کرکے لوٹ آئے تو اس کا تمتع باطل ہوگیا. کیونکہ دو نسک کے درمیان اس کا اپنے گھر میں المام صحیح شمار ہوگا اور ایسے المام سے تمتع باطل ہو جاتا ہے. بہت سے تابعین کرام سے اسی طرح مروی ہے.

جب قربانی کا جانور ساتھ لے کر جائے تو اس کا المام صحیح نہ ہوگا (یعنی گھر آ کر بھی محرم رہیگا) اور تمتع باطل نہ ہوگا. یہ امام اعظمؒ اور امام ابو یوسف کا قول ہے. امام محمد بطلان تمتع کے قائل ہیں کیونکہ اس نے عمرے اور حج کی ادائیگی دو سفروں میں کی ہے.

شیخینؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جب

تک وہ تمتع کی نیت برقرار رکھے۔ اس پر مکہ مکرمہ
لوٹ کر آنا واجب ہوتا ہے اور چونکہ وہ قربانی کا
جانور ساتھ لے کر گیا ہوا ہے اس لیے احرام نہیں
کھول سکتا ۔ پس اس کے گھر آنے کے باوجود المام
صحیح نہ ہوگا (کیونکہ وہ گھر آ کر بھی محرم رہتا
ہے) بخلاف اس صورت کے جب مکی کوفہ کی طرف نکل
جائے اور عمرے کا احرام باندھ کر قربانی کا جانور بھی
ساتھ لے لے۔ تب بھی متمتع نہ ہوگا ۔ کیونکہ اس پر
مکہ مکرمہ میں لوٹ کر آنا واجب نہیں ۔ (وہ تو ہے
ہی مکہ کا باشندہ) لہذا اہل و عیال کے ساتھ اس کا
المام صحیح شمار ہوگا ۔

**مسئلہ :** جس شخص نے حج کے مہینوں سے پہلے
عمرے کا احرام باندھا اور طواف بیت اللہ کے سلسلے میں
چار سے کم چکر لگائے پھر حج کا زمانہ آگیا اور اس
نے طواف کے باقیماندہ چکر پورے کرلیے پھر حج کا
احرام باندھ لیا تو وہ متمتع ہوگا ۔ کیونکہ ہمارے
نزدیک احرام شرط کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے حج
کے زمانے پر اس کی تقدیم جائز ہے ۔ (جیسا کہ طہارت
نماز کے لیے شرط ہے اور نماز سے مقدم ہو سکتی ہے)
البتہ افعال کی ادائیگی کا اعتبار اوقاف حج ہی میں ہوگا
اور مذکورہ صورت میں افعال کا اکثر حصہ اوقات حج
میں پایا گیا اور اکثر حصے کے لیے کل کا حکم ہوتا ہے ۔

اگر اوقات حج سے پہلے عمرے کے طواف کے لیے
چار یا زیادہ چکر لگائے پھر اسی سال حج کرے تو
متمتع نہ ہوگا ۔ کیونکہ اس نے عمرے کے افعال کا اکثر
حصہ زمانۂ حج سے پہلے ادا کر لیا تھا ۔ (طواف کا
اکثر حصہ ادا کرنے کی بناء پر اس کی کیفیت یہ ہے کہ)
اس کا عمرہ مباشرت سے فاسد نہ ہوگا (البتہ مباشرت
کی صورت میں دم واجب ہوگا) گویا یہ شخص زمانۂ حج
سے پہلے احرام کھول چکا ہے (اس لیے متمتع نہ ہوگا)
امام مالکؒ زمانۂ حج میں اتمام اور تکمیل کا اعتبار
کرتے ہیں (کہ اگر زمانۂ حج میں طواف کا خواہ ایک
چکر ہی پایا گیا تو متمتع ہوگا کیونکہ طواف کی تکمیل
زمانۂ حج میں ہوئی ہے) ہمارا بیان کردہ اصول
"للأکثر حکم الکل" امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے ۔
دوسری بات یہ ہے کہ تمتع اداء افعال پر مترتب ہوتا
ہے اور متمتع دو نسکوں کی ادائیگی سے ایک سفر میں
زمانۂ حج ہی میں بہرہ ور ہو سکتا ہے (لہذا ضروری ہے
کہ تمام یا کم از کم اکثر افعال زمانۂ حج میں
پائے جائیں) ۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ شوال ،
ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن حج کے مہینے
کہلاتے ہیں ۔ عبادلۂ ثلاثہ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے
اسی طرح مروی ہے (عبادلۂ ثلاثہ سے مراد عبداللہ بن

عمرؓ ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں)
نیز دسویں ذی الحجہ گزرنے پر حج کا وقت فوت ہو جاتا
ہے . اگر وقت باقی ہوتا تو (حج کا) فوت ہونا کیسے
متحقق ہوتا . معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے ارشاد :
"الحج أشهر معلومات" . سے دو ماہ پورے اور تیسرے
کا کچھ حصہ ہے . تیسرا ماہ پورا مراد نہیں لیا جا سکتا .
(امام مالکؒ آخر ذی الحجہ تک طواف زیارت کی ادائیگی
کے جواز کے قائل ہیں . مگر احناف اسے جائز
نہیں سمجھتے) .

**مسئلہ** : اگر زمانۂ حج سے پہلے حج کے لیے احرام
باندھ لیا تو جائز ہوگا (اگرچہ مکروہ ہے) اور اس احرام
سے حج کر سکتا ہے . امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ
مذکورہ احرام سے حج نہیں کر سکتا ، عمرہ کر سکتا
ہے (اگر اس احرام سے حج کرے گا تو بھی عمرہ ہی
ادا ہوگ) کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک احرام رکن
کی حیثیت رکھتا ہے . (تو دوسرے ارکان کی طرح اس
کی تقدیم بھی جائز نہ ہوگی) لیکن ہمارے نزدیک احرام
شرط ہے . یہ طہارت کے مشابہ ہے اور طہارت کو
نماز کے وقت سے مقدم کیا جا سکتا ہے . دوسری بات
یہ ہے کہ انسان احرام باندھنے سے اپنے لیے کئی اشیاء
ممنوع کر لیتا ہے . (مثلاً سلا ہوا کپڑا ، شکار اور
عورت سے مباشرت وغیرہ) اور کئی اشیاء اپنے ذمے واجب

کر لیتا ہے (مثلاً طواف ، رمی اور سعی وغیرہ) اور یہ کام کسی وقت بھی کر لیا جائے صحیح ہوگا . جیسا کہ احرام کا میقات سے پہلے باندھ لینا . (اگرچہ احرام باندھنے کی صحیح جگہ میقات ہے لیکن میقات سے پہلے ہی احرام باندھ لے تو جائز ہوگا) .

**مسئلہ :** امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص زمانۂ حج میں کوفہ سے عمرہ کرنے آیا اور عمرہ سے فارغ ہو کر اس نے حلق یا قصر کیا پھر مکہ مکرمہ یا بصرہ میں اقامت اختیار کرلی اور اسی سال فریضہ حج ادا کیا تو وہ متمتع ہوگا . مکہ میں سکونت اختیار کرنے کی صورت میں تمتع کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی سفر میں زمانۂ حج میں دو نسک سے بہرہ ور ہوا ہے . (کیونکہ وہ مکہ مکرمہ سے نکل کر اپنے وطن میں نہیں گیا) اور دوسری صورت میں (جب عمرہ سے فارغ ہو کر بصرہ میں اقامت اختیار کرے) وہ بالاتفاق متمتع ہوگا . بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک وہ متمتع نہ ہوگا کیونکہ متمتع وہ شخص ہوتا ہے جس کا عمرہ میقاتی ہو اور حج مکی (یعنی عمرے کا احرام میقات سے باندھا ہو اور حج کا مکہ مکرمہ سے) لیکن مذکورہ صورت میں دونوں نسک یعنی عمرہ اور حج میقاتی ہیں .

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ لوٹ کر اپنے وطن میں نہ جائے اس کا پہلا سفر قائم رہے گا. چنانچہ ایک ہی سفر میں دو نسک کا اجتماع پایا گیا. (پس وہ متمتع ہوگا) اور اس پر دم تمتع واجب ہوگا.

مسئلہ : اگر کوئی شخص عمرہ کرنے آئے لیکن اسے فاسد کردے اور (افعال عمرہ سے) فارغ ہو کر قصر کرے اور بصرہ میں سکونت اختیار کرلے پھر اوقات حج میں عمرہ کرے اور اسی سال فریضۂ حج بھی ادا کرے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک متمتع نہ ہوگا. لیکن صاحبینؒ کی رائے میں متمتع ہوگا کیونکہ اس نے بصرہ سے سفر کی ابتداء نئے سرے سے کی ہے اور اسی ایک سفر میں اس نے دو نسک کی ادائیگی کا فائدہ اٹھایا.

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے وطن میں لوٹ کر نہ جائے اس کا پہلا سفر ہی قائم رہتا ہے. (ہاں اگر کوفہ چلا جاتا ہے اور وہاں سے عمرہ اور حج کے لیے روانہ ہوتا تو متمتع ہو سکتا تھا. کیونکہ وطن کی طرف واپسی سے سابقہ سفر قائم نہ رہتا اور نیا سفر شروع ہو جاتا).

مسئلہ : اگر کوئی شخص اپنے اہل و عیال کے پاس چلا گیا اور پھر زمانہ حج میں (اس نے) عمرہ کیا اور اسی سال حج بھی کیا تو بالاتفاق متمتع ہوگا. کیونکہ اہل و عیال کے پاس جانے کی بناء پر سابقہ سفر اختتام

پذیر ہوا اور یہ سفر جدید ہوگا اور اس ایک ہی سفر میں دو صحیح نسک (عمرہ و حج) اسے میسر آگئے .

**مسئلہ :** اگر (مذکورہ شخص عمرہ فاسد کرکے) مکہ ہی میں مقیم رہا اور بصرہ بھی نہ گیا . حتی کہ زمانہ حج میں عمرہ کیا اسی سال حج بھی کرلیا تو بالاتفاق متمتع نہ ہوگا کیونکہ اس کا عمرہ مکی ہے (اور تمتع عمرۂ میقاتی کی صورت میں ہوتا ہے) .

**مسئلہ :** اور جو شخص زمانہ حج میں عمرہ کرے اور اسی سال حج بھی کرے ان دو (یعنی عمرہ و حج) میں سے جسے بھی فاسد کرے تو اس کے افعال کی تکمیل کرے کیونکہ افعال کی تکمیل کے بغیر وہ احرام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور دم تمتع ساقط ہوگا . کیونکہ وہ ایک سفر میں دو صحیح نسک سے بہرہ مند نہیں ہوا . (بلکہ ایک تو فاسد ہوگیا) .

**مسئلہ :** جب عورت نے تمتع کیا اور قربانی کے طور پر ایک بکری ذبح کی تو یہ بکری دم تمتع کے قائم مقام نہ ہوگی . (کیونکہ مسافر ہونے کی وجہ سے اس پر قربانی واجب نہ تھی) اس نے ایک غیر واجب امر کی ادائیگی کی . (لہذا یہ دم واجب کے قائم مقام نہ ہوگی . یہی حکم مرد کے بارے میں ہے . (کہ اگر وہ قربانی کے طور پر بکری ذبح کرے تو یہ قربانی دم تمتع کے قائم مقام نہ ہوگی) .

مسئلہ : اگر احرام کے وقت عورت کو حیض آ جائے تو غسل کر کے احرام باندھ لے اور دوسرے حجاج کی طرح افعال کی ادائیگی کرے . البتہ طہارت حاصل ہونے تک بیت اللہ کا طواف نہ کرے . اس کی دلیل حضرت عائشہ رض کی روایت ہے کہ جب وہ مقام سرف میں تشریف فرما تھیں تو حائضہ ہوگئیں (بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رض سے مروی ہے کہ ہم سفر پر روانہ ہوئے اور جب مقام سرف پر پہنچے تو حائضہ ہوگئی . رسول اکرم ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں رو رہی تھی . حضور ﷺ نے رونے کی وجہ دریافت فرمائی تو میں نے حقیقت حال عرض کر دی . آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ معاملہ تو اللہ تعالی نے بنات آدم علیہ السلام کے لیے ضروری قرار دیا ہے . حج کے افعال کی ادائیگی کرو . البتہ حصول طہارت تک بیت اللہ کا طواف نہ کرنا) کیونکہ طواف مسجد میں ہوتا ہے . (اور حائضہ کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت ہے) لیکن وقوف میدان عرفات میں ہوتا ہے جو جنگل کے حکم میں ہے . (لہذا حائض کو وقوف عرفات سے کوئی امر مانع نہیں) اور یہ مذکورہ غسل احرام کے لیے ہے . نماز کے لیے نہیں (یعنی یہ غسل نظافت ہے غسل طہارت نہیں ہے) لہذا افعال حج کے لیے مفید ہوگا .

مسئلہ : اگر عورت کو وقوف عرفات اور طواف

زیارت کے بعد حیض آئے تو وہ مکہ سے لوٹ آئے اور طواف صدر کے ترک کے سلسلے میں اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا ۔ کیونکہ رسول ﷺ نے حائضہ عورتوں کو طواف صدر چھوڑ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ۔

مسئلہ : جو شخص مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کرلے اس کے لیے طواف صدر ضروری نہیں ہوتا کیونکہ طواف صدر دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ مکرمہ سے لوٹ کر (اپنے اپنے وطن کو) جارہے ہوں ۔

البتہ اگر اس نے ایسے وقت میں اقامت کی نیت کی جب مکہ مکرمہ سے واپس جانا مباح ہو چکا تھا (یعنی اگر ایام نحر کے تیسرے دن کے گزر جانے کے بعد اقامت کی نیت کرے) تو طواف صدر لازم ہوگا ۔ امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح روایت کیا گیا ہے اور بعض نے (اس مسئلے کو) امام محمدؒ سے روایت کیا ہے ۔ کیونکہ طواف صدر کا وقت داخل ہو جانے کی وجہ سے اس پر واجب ہو جائے گا اور دخول وقت کے بعد نیت اقامت سے ساقط نہیں ہوتا (اگر طواف صدر کے وقت سے پہلے پہلے نیت اقامت کر لیتا تو طواف صدر واجب نہ رہتا) ۔

**واللہ اعلم بالصواب**

# بَابُ الجنَایَات

# جنایات کا بیان

(جنایت سے مراد ایسا فعل ہے جس کا کرنا محرم کے لیے ممنوع ہے۔ اگر وہ ایسے فعل کا ارتکاب کرے تو اسے جنایت کہا جائے گا).

مسئلہ : اگر محرم خوشبو استعمال کرے تو اسے کفارہ دینا ہوگا۔ اگر پورے عضو یا اس سے زائد کو خوشبو لگائے تو اس پر دم (یعنی جانور کی قربانی دینا) واجب ہوگا۔ پورے عضو کی مثال سر، پنڈلی، ران اور اس کے مشابہ اعضاء ہیں۔ کیونکہ انتفاع کے کامل ہونے سے جنایت بھی کامل ہوگی اور انتفاع کامل پورے عضو کی صورت میں ہوتا ہے۔ لہذا جنایت کا کامل موجب (یعنی جنایت کا مطالبہ اور تقاضا) عضو کامل پر مترتب ہوگا۔ (یعنی جب کامل عضو کو خوشبو لگائے گا تو جنایت بھی کامل ہوگی اور اسے تاوان کے طور پر جانور کی قربانی دینا ہوگی).

اگر عضو کامل سے کم حصے کو خوشبو لگائے تو اس پر صدقہ واجب ہوگا، (دم نہ ہوگا)، کیونکہ

یہ جنایت قاصرہ ہے ۔ (لہذا تاوان بھی کامل نہ ہوگا بلکہ قاصر ہی ہوگا) ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ عضو کی مقدار کے مطابق دم واجب ہوگا (اگر نصف عضو پر خوشبو لگائی تو نصف دم ہوگا اور عضو کی چوتھائی کی صورت میں میں دم کی چوتھائی واجب ہوگی) ۔ کفارے کے دم کا اعتبار کل اور جزء کے باہمی تناسب سے کیا جائے گا ۔ منتقی میں مذکور ہے کہ جب عضو کی چوتھائی پر خوشبو لگائے تو حلق رأس پر قیاس کرتے ہوئے دم کامل واجب قرار دیا جائے گا ۔ (یعنی اگر سر کی چوتھائی منڈوائے تب بھی دم واجب ہوتا ہے) ہم ان شاء اللہ ربع عضو پر خوشبو لگانے اور ربع رأس کے حلق کے درمیان فرق آیندہ اوراق میں بیان کریں گے ۔

مسئلہ : تمام جنایات میں جہاں دم واجب ہوتا ہے بکری کی قربانی سے ادا ہو جاتا ہے ۔ مگر دو قسم کی جنایات اس حکم سے مستثنی ہیں (ان میں بدنہ واجب ہوتا ہے) ۔ ان دونوں جنایات کی تفصیل ہم إن شاء اللہ باب الهدی میں بیان کریں گے ۔

مسئلہ : احرام کے سلسلے میں ہر اس صدقے میں جس کا شرعی طور پر اندازہ نہیں بتایا گیا گندم کا نصف صاع واجب ہوتا ہے ۔ البتہ جوں اور مکڑی کے مارنے پر نصف صاع سے کم ہوگا (یعنی اپنی منشاء کے مطابق

ادا کرے)۔ امام ابو یوسفؒ سے اسی طرح روایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ** : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر سر کو مہندی لگائے تو اس کے ذمے دم ہوگا۔ کیونکہ حنا بھی خوشبو کی ایک قسم ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ حنا بھی خوشبو ہے۔

**مسئلہ** : اگر (حناء لگا کر) سر کو ڈھانپ لیا (عموماً لوگ سر پر حناء لگا کر کپڑا لپیٹ دیتے ہیں تاکہ مہندی سر پر جمی رہے اور رنگ صحیح دے) تو اس پر دو دم ہوں گے۔ ایک دم خوشبو لگانے کی بناء پر اور دوسرا سر ڈھانکنے کی وجہ سے۔

**مسئلہ** : اگر وسمہ پودے کے پتوں سے خضاب لگائے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا کیونکہ اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر سر درد کے علاج کے لیے سر کو وسمہ سے خضاب لگائے تو اس پر تاوان ہوگا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ (گویا وسمہ سے) اس نے سر کو ڈھانپا ہے اور یہی صحیح ہے۔

امام محمدؒ نے مبسوط میں تو سر اور داڑھی دونوں کا ذکر کیا ہے مگر الجامع الصغیر میں صرف سر کا تذکرہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کی

جنایت الگ الگ ہے . (یعنی سر کی جنایت کا دم الگ اور داڑھی کی جنایت کا دم علیحدہ ہوگا) .

**مسئلہ** : اگر زیتون کا تیل لگائے تو امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں اس دم واجب ہوگا . صاحبینؒ ایجاب صدقہ کے قائل ہیں . امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر بالوں میں تیل لگائے تو اس پر دم واجب ہوگا ، کیونکہ تیل کے استعمال سے اس نے بالوں کی پراگندگی اور میل کچیل کا ازالہ کیا (حالیکہ ایسا کرنا محرم کے لیے ممنوع ہے). اگر بالوں کے علاوہ بدن کے کسی اور حصے پر تیل استعمال کرے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا ، کیونکہ دیگر اعضاء میں پراگندگی وغیرہ کے ازالے کی صورت نہیں پائی جاتی .

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ زیتون کا تیل کھانے کے کام آتا ہے ، اور اسے سر میں لگانے سے کچھ نہ کچھ انتفاع تو ضرور حاصل ہوتا ہے ؛ اور کچھ نہیں تو کم از کم جوئیں مر جاتی ہیں اور بالوں کی پراگندگی جاتی رہتی ہے . لہذا جنایت قاصرہ ہوگی (اور صدقہ دینا واجب ہوگا) .

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زیتون کا تیل ہر خوشبو کے لیے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ، (یعنی اس میں دوسری خوشبوئیں ملا کر معطر کیا جاتا ہے ، اور کسی نہ کسی قسم کی خوشبو اس میں بھی پائی

جاتی ہے ، جوئیں ختم کرتا ہے ، بالوں کو نرمی اور تازگی بخشتا ہے اور میل کچیل اور بالوں کی پراگندگی کا ازالہ کرتا ہے ۔ لہذا ان مذکورہ امور کے مد نظر جنایۃ کامل ہوگی اور دم واجب ہوگا ۔ رہی یہ بات کہ زیتون کا تیل کھانے کے کام آتا ہے تو زعفران کی طرح اس کا کھانے کے کام آنا تاوان واجب کرنے کے منافی نہیں ہے ۔

یہ مذکورہ اختلاف زیتون کے خالص تیل کے بارے میں ہے ۔ اور تلوں کا خالص تیل جس میں روغن بنفشہ ، یاسمین یا کوئی اور خوشبو ملا کر معطر کر لیا جائے تو اس کے استعمال سے دم واجب ہوگا ۔ کیونکہ ایسے مرکب تیل کے استعمال سے خوشبو کا استعمال کرنا لازم آتا ہے ، بشرطیکہ اس تیل کو خوشبو کے طور پر استعمال کرے ۔ (اگر دواء کے طور پر استعمال کرے تو دم واجب نہ ہوگا) ۔

**مسئلہ** : اگر تیل کو زخم پر بطور دوا لگائے یا پاؤں کے شگافوں میں استعمال کرے (جب سردی اور خشکی سے پاؤں پھٹ جاتے ہیں) تو اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا ۔ کیونکہ روغن زیتون فی نفسہ انواع خوشبو سے نہیں ہے بلکہ (خوشبو کا مرکب تیار کرنے کے لیے) اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یا اسے من وجہ خوشبو کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اس

صورت میں خوشبو کے طور پر استعمال کرنا شرط ہوگا
بخلاف اس صورت کے کہ جب کستوری یا اس کے
مشابہ اشیاء مثلاً عنبر ، کافور اور زعفران وغیرہ بطور
دواء استعمال کرے (تو اس صورت میں خوشبو کے
طور پر استعمال کرنے کا ارادہ شرط نہ ہوگا کیونکہ یہ
اشیاء فی نفسہ خوشبو ہیں اس لیے کفارہ لازم ہوگا) .

**مسئلہ :** اگر محرم پورا دن سلا ہوا کپڑا پہنے رہا یا
اس نے سر کو ڈھانپے رکھا تو اس پر دم واجب ہوگا . اگر
وقت کی مقدار اس سے کم ہو تو صدقہ واجب ہوگا
امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر نصف یوم سے زیادہ
عرصہ تک سلا ہوا کپڑا پہنے رہا یا سر کو ڈھانپے
رکھا تو اس پر دم واجب ہوگا . امام ابو حنیفہؒ کا
پہلا قول بھی یہی تھا . (پھر انھوں نے اس قول سے
رجوع کرکے یوم کامل کی شرط لگائی) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک مرتبہ پہن
لینے سے دم واجب ہوگا (خواہ تھوڑی دیر کے بعد اتار
دے کیونکہ جب سلا ہوا کپڑا اس نے بدن پر پہن
لیا تو اسے کامل انتفاع حاصل ہوگیا .

احناف کہتے ہیں کہ کپڑا زیب تن کرنے کا
مقصد انتفاع کامل ہی ہے . (کہ اپنے جسم کو گرمی
یا سردی کے اثرات سے بچا سکے). لیکن انتفاع کے کامل
ہونے کے لیے مدت کا اعتبار ضروری ہوگا تاکہ دم واجب

ہو سکے ۔ (اور صرف ایک مرتبہ پہن کر اتار دینے کی صورت میں کامل انتفاع تو حاصل ہونا کجا قاصر انتفاع بھی حاصل نہیں ہوتا) ۔ لہٰذا ہم نے اس مدت کا اندازہ کامل دن سے لگایا ۔ کیونکہ کپڑا عموماً دن کے وقت پہنا جاتا ہے اور رات کو تو عادۃً بھی اتار دیا جاتا ہے ۔ (اس لیے یوم کامل سے کم وقت میں) جنایۃ قاصرہ نامکمل ہوگی اور صدقہ واجب ہوگا ۔ البتہ امام ابو یوسفؒ نے (لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ) کے اصول کے پیش نظر) دن کے اکثر حصے کو پورے دن کے قائم مقام قرار دیا ہے ۔

مسئلہ : اگر قمیص کو بطور چادر استعمال کیا یا اس سے توشح کیا۔ (توشح کی صورت یہ ہے کہ کپڑے کو دائیں بغل کے نیچے سے گزار کر بائیں کندھے پر ڈال دیا جائے اس طرح دایاں کندھا ننگا رہتا ہے ۔ احرام کی چادر بھی اسی طرح لپیٹی جاتی ہے) یا شلوار کو بطور چادر استعمال کیا تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس نے سلا ہوا کپڑا پہنا نہیں (بلکہ اوڑھا ہے) ۔

مسئلہ : اگر اپنے دونوں کندھے قبا میں ڈال لیے لیکن اپنے بازو قباء کے بازوؤں میں نہ ڈالے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ امام زفرؒ کا اختلاف منقول ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں اس نے قباء کو

قباء کے زیب تن کرنے کی مناسب صورت میں نہیں پہنا۔
اسی بناء پر اس کی حفاظت کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے۔
(یعنی چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے کی صورت میں
ہاتھ سے پکڑنا پڑتا ہے ورنہ قباء نیچے گر جاتی ہے)۔

سر ڈھانپنے کی مدت کی مقدار ہم ذکر کر چکے
ہیں (کہ پورا دن ہو) اور اس بارے میں کسی کو
اختلاف نہیں کہ جب سارا دن سر کو ڈھانپے رکھے
تو دم واجب ہوگا، کیونکہ احرام کے دوران سر کا
ڈھانپنا ممنوع ہے۔

سر کا بعض حصہ ڈھانپنے کی صورت میں امام
ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلق اور ستر پر قیاس کرتے
ہوئے سر کی چوتھائی کا اعتبار ہوگا۔ (یعنی اگر احرام
کی حالت میں سر کا چوتھائی حصہ منڈوا دے تو دم
واجب ہوتا ہے یا نماز کی حالت میں (اس) عضو کا۔
جس کا ستر واجب ہے۔ چوتھا حصہ ننگا ہو جائے تو
نماز فاسد ہوتی ہے)۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض لوگ
سر کے بعض حصے کو عادۃً ڈھانپتے ہیں، (تاکہ گرمی
اور سردی کے اثرات سے سر کو بچایا جا سکے جیسے
لوگ سروں پر چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اوڑھ لیتے ہیں)۔
امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ کثرت کی حقیقت کا
اعتبار کرتے ہوئے سر کے اکثر حصے کا اعتبار ہوگا،
(یعنی کثرت کا تحقق چونکہ اکثر حصے کی بناء پر

ہوتا ہے لہذا اگر سر کا اکثر حصہ ڈھانپ لیا تو جنایۃ لازم آئے گی) . .

**مسئلہ** : اگر سر کا یا داڑھی کا چوتھا حصہ یا اس سے زیادہ منڈوا دیا تو دم واجب ہوگا . اگر چوتھے حصے سے کم ہو تو صدقہ . امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ پورے سر یا پوری داڑھی کے منڈوانے پر دم واجب ہوگا .

امام شافعیؒ حرم کی نباتات پر قیاس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تھوڑے سے بالوں کے منڈوانے کی صورت میں بھی دم واجب ہوگا . (یعنی حرم کی حدود کے اندر اگر ایک پودا بھی توڑ دے تو دم واجب ہوتا ہے ؛ قلیل اور کثیر میں فرق نہیں کیا جاتا . اسی طرح سر اور داڑھی کے بالوں میں بھی قلیل کی صورت میں بھی دم واجب ہوگا) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ سر کے بعض حصہ کو منڈوانے سے انتفاع کامل حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا رواج بھی ہے . (جیسے آج کل لوگ بالوں کی قطع و برید انگریزی طرز پر کراتے ہیں) پس جنایۃ کامل ہوگی اور بعض (یعنی چوتھائی) حصے سے کم میں جنایۃ قاصرہ ہوگی بخلاف اس صورت کے کہ جب کسی عضو کے چوتھے حصے پر خوشبودار تیل لگائے کیونکہ اس سے کوئی خاص مقصد حاصل نہیں ہوتا ، (بلکہ عموماً پورے

عضو پر مالش کی جاتی ہے) ، اسی طرح داڑھی کے بعض حصوں کو منڈوانے کا عراق اور عرب وغیرہ میں رواج ہے .

**مسئلہ** : اگر پوری گردن منڈا لے تو اس پر دم واجب ہوگا کیونکہ گردن ایسا عضو ہے جس کا مونڈنا مقصود ہوتا ہے . اسی طرح اگر دونوں بغلیں یا ایک بغل مونڈی تو اس پر دم واجب ہوگا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی کثافت دور کرنے اور راحت حاصل کرنے کے لیے مونڈا جاتا ہے . موئے زیر ناف کا مونڈنا بھی وجوب دم میں ان کے مشابہ ہے .

امام محمدؒ نے یہاں الجامع الصغیر میں بغلوں کے حلق کا ذکر کیا ہے مگر مبسوط میں نتف کا ذکر ہے . (نتف بمعنی اکھاڑنا یعنی بجائے مونڈنے کے بالوں کا اکھاڑ دینا) اور یہی سنت بھی ہے . امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب پورے عضو کے بال مونڈے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے اور عضو سے کم کی صورت میں صدقہ . عضو کامل سے مراد سینہ ، پنڈلی اور اس کے مشابہ اعضاء ہیں . (ان اعضاء سے مراد وہ اعضاء ہیں جن کے بال عام طور پر مونڈے نہیں جاتے) کیونکہ ان کے بال مونڈنے سے مقصد زیب و زینت ہوتا ہے .

**مسئلہ** : اگر مونچھوں کا کچھ حصہ کتروائے تو

اس پر صدقہ واجب ہوگا ۔ صدقے کی مقدار کا تعین عادل شخص کریں گے ۔ اس کا مطلب یہ ہے ، عادل شخص ملاحظہ کریں کہ کتری ہوئی مونچھوں کی مقدار کو ربع لحیہ سے کیا نسبت ہے ۔ اسی مقدار کے مطابق صدقہ واجب ہوگا ۔ مثلاً اگر کتری ہوئی مونچھیں داڑھی کے چوتھے حصے کی چوتھائی یعنی $\frac{1}{16}$ حصے کے برابر ہیں ، تو بکری کے چوتھے حصے کی قیمت لازم ہوگی ۔ متن میں لفظ "اخذ" یعنی کترنا استعمال کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ مسنون طریقہ کتروانا ہی ہے منڈانا نہیں ۔ نیز یہ امر سنت سے ثابت ہے کہ مونچھوں کو اس قدر کاٹے کہ اوپر کے ہونٹ کے کناروں کے متوازی ہو جائیں ۔

**مسئلہ** : امام قدوری فرماتے ہیں کہ اگر سینگی لگوانے کی جگہ سے بال مونڈ دے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دم واجب ہوگا ۔ صاحبینؒ کے قول کے مطابق اس کے ذمے صدقہ ہوگا کیونکہ بالوں کے صاف کرنے کا مقصد سینگی لگوانا ہے اور حالت احرام میں سینگی لگوانا ممنوع نہیں ہے اور جو امر اس تک وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے وہ بھی ممانعت کی حدود سے خارج ہوگا ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بال صاف کرانے میں کسی حد تک میل کچیل کا ازالہ ہو جاتا ہے ۔ اس لیے صدقہ واجب ہوگا ۔

امام ابو حنیفہؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ سینگی لگوانے کے لیے بالوں کی صفائی ضروری ہوتی ہے . کیونکہ اس کے بغیر ہم اصل مقصود (یعنی سینگی لگوانے کو حاصل نہیں کر سکتے . اور چونکہ عضو کامل سے میل کچیل کا ازالہ پایا گیا ہے لہذا دم واجب ہوگا . (عضو کامل سے مراد سینگی لگوانے کی جگہ ہے) .

**مسئلہ** : اگر ایک محرم دوسرے محرم کا سر اس کے کہنے پر یا کہے بغیر مونڈ دے تو مونڈنے والے پر صدقہ ہوگا اور منڈانے والے پر دم . امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر محرم کے کہنے کے بغیر حلق کیا گیا تو محلوق پر کوئی تاوان نہ ہوگا . مثلاً محرم گہری نیند سو رہا ہو اور دوسرا محرم اس کا سر موند دے ، (تو اس میں محلوق کا کیا قصور ؟) نیز جبر واکراہ میں امام شافعیؒ کا اصول یہ ہے کہ جبر واکراہ کی صورت میں مکرہ یعنی مجبور کیے گئے شخص پر اس فعل کے سلسلے میں دنیا و آخرت میں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا اور نیند کی مذکورہ صورت میں بطریق اولی مؤاخذہ ساقط ہوگا . (کیونکہ اس صورت میں اس کا اپنا کوئی فعل ایسا نہیں جس کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈالی جائے جو کچھ ہوا اس کی بے خبری میں ہوا) .

احناف کے اصول کے مطابق نیند اور اکراہ کی صورت میں آخرت میں تو کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا لیکن

دنیا میں اس پر حکم ضرور مترتب ہوگا ۔ اور نیند کی مذکورہ صورت میں تو سبب بھی متحقق ہے ۔ کیونکہ آخر محلوق بھی تو آرام و راحت اور میل کچیل کے ازالے سے بہرہ ور ہوا ہے ۔ لہذا حتماً دم واجب ہوگا ۔ مجبور اور مضطر محرم کی صورت اس سے علیحدہ ہے (یعنی اگر محرم کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے جس کی بناء پر وہ بال منڈانے پر مجبور ہو) کیونکہ اس کی بیماری آفتِ سماوی کی بناء پر ہے اور نیند کی صورت میں (آفت سماوی نہیں بلکہ آفت ارضی ہے جو) بندوں کی طرف سے ہے ۔ لہذا مضطر کو اختیار ہوگا کہ اگر چاہے تو ذبح کرے یا چھ مساکین کو کھانا کھلا دے یا تین روزے رکھ لے ۔

مذکورہ صورت میں محلوق (دم یا اس کی قیمت کا ، حالق سے مطالبہ نہ کرے گا (بلکہ خود ادا کرے گا) ، کیونکہ دم تو اس کے حصول راحت اور ازالہ تفث کے سبب واجب ہوا ہے ۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے حق مہر کے سلسلے میں دھوکا دیا گیا ہو ۔ (اس کی صورت یوں ہے کہ مثلاً ا نے ب سے کہا کہ یہ میری باندی ہے اسے خرید کر نکاح کرلو ب نے قیمت ادا کرنے کے بعد نکاح کرلیا اور اس باندی سے بچہ پیدا ہوا ۔ اس عرصہ میں باندی کا اصل مالک ج آ پہنچا اور اس نے ب سے بچے کی قیمت کا مطالبہ کیا

تو اسے ج کو بچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی . مگر یہ
یہ قیمت آ سے وصول کرے گا کیونکہ اصل مجرم اور
دھوکا باز تو آ ہے . نیز ج اپنی باندی کے مہر کا مطالبہ
بھی ب سے کرے گا اور اس سلسلےمیں ب مہر کی رقم آ
سے نہیں مانگ سکتا کیونکہ نکاح سے تو یہ خود ہی
لطف اندوز ہوا ہے . لہذا اسے اپنے پاس سے مہر
دینا ہوگا) .

مذکورہ صورت میں اگر حالق غیر محرم ہو تو
بھی محلوق پر دم واجب ہوگا اور حالق پر دونوں
صورتوں میں (یعنی محرم کے کہنے پر حلق کرے یا
کہے بغیر) صدقہ واجب ہوگا . امام شافعیؒ محلوق پر
کسی قسم کے تاوان کے قائل نہیں .

ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان یہی اختلاف
اس صورت میں بھی ہے کہ جب محرم غیر محرم کا حلق
کرے (ہمارے نزدیک اس پر صدقہ ہوگا اور امام شافعیؒ
کے نزدیک کچھ نہ ہوگا) . امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے
کہ دوسرے کا سرمونڈنے والے آدمی کو کوئی راحت
میسر نہیں آتی حالیکہ دم کو واجب کرنے والی چیز
حصول راحت اور ازالہ تفث ہی ہے . (مگر محرم کے
حق میں ان سے کوئی امر بھی موجود نہیں) .

اس کے جواب میں احناف کا کہنا ہے کہ احرام
کے دوران ہر چیز کا جس میں نشو و نما کی صلاحیت

موجود ہو ازالہ ممنوع ہے ۔ کیونکہ ایسی ہر چیز نباتات حرم کی طرح امان میں ہوتی ہے ۔ (اور اس سے تعرض کرنا اور اسے نقصان پہنچانا ممنوع ہے) ۔ لہذا اس کے اپنے بالوں اور دوسرے کے بالوں میں کوئی فرق نہ ہوگا ، دونوں کا حکم یکساں ہوگا ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ دوسرے کے بال کاٹنے کی صورت میں جنایۃ قاصرہ ہوتی ہے (اس لیے صدقہ واجب ہوگا دم نہیں) ۔ اگر اس کے اپنے بالوں کے ساتھ یہ صورت پیش آتی تو جنایۃ کاملہ ہوتی ۔

**مسئلہ** : اگر محرم شخص غیر محرم کی مونچھیں کترے یا اس کے ناخن کاٹے تو اپنی منشاء کے مطابق مساکین کو کھانا کھلائے اس کی وجہ ہم بیان کرچکے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس صورت میں بھی انتفاع کسی نہ کسی حیثیت سے پایا جاتا ہے ۔ کیونکہ (حلق یا ناخن کاٹنے کے وقت) دوسرے کی میل کچیل سے اسے کچھ نہ کچھ اذیت ضرور ہوتی ہے ۔ اگرچہ یہ اذیت اس صورت میں اپنی میل کچیل کی اذیت سے کم ہے ۔ لہذا اس پر مساکین کو کھلانا واجب ہوگا (دم واجب نہ ہوگا) ۔

**مسئلہ** : اگر دونوں ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹے تو اس پر دم واجب ہوگا ۔ کیونکہ احرام کے دوران ناخن کاٹنے کی اس بناء پر ممانعت ہے کہ اس سے

میل کچیل اور اس چیز کا جسے بدن میں نشو و نما حاصل ہوتا ہے ازالہ لازم آتا ہے ۔ چونکہ تمام ناخن کاٹنے میں انتفاع کامل ہے اس لیے دم لازم ہوگا ۔

**مسئلہ** : اگر مذکورہ صورت میں تمام ناخن ایک ہی مجلس میں کاٹے تو ایک دم واجب ہوگا ۔ اگر یہ صورت مختلف مجالس میں پیش آئے تو بھی امام محمدؒ کے نزدیک دم واحد ہی لازم ہوگا ۔ کیونکہ جنایۃ کے سلسلے میں اصول تداخل پر عمل کیا جاتا ہے ۔ (یعنی اگر دونوں ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹنے کو الگ الگ جنایۃ تصور کریں تو اس میں محرم کے لیے تکلیف مالایطاق ہے اس لیے جنایات ایک دوسرے میں داخل ہوکر جنایۃ واحدہ ہو جائیں گی اور یہ کفارۂ فطر کے مشابہ ہے (کہ اگر ایام رمضان میں کئی روزے افطار کرے تو سب کے لیے ایک ہی کفارہ ہوگا ہر روزے کے لیے الگ الگ کفارہ نہیں) ۔ البتہ جس وقت کفارہ درمیان میں آ جائے تو دوسری جنایۃ کا کفارہ بھی نیا ہوگا کیونکہ پہلا تو تکفیر سے ختم ہوگیا ۔ (مثلاً ایک ہاتھ کے ناخن کاٹے اور کفارہ ادا کر دیا اور بعد میں دوسرے ہاتھ کے ناخن کاٹ ڈالے تو اب نیا کفارہ واجب ہوگا ۔ کیونکہ پہلا کفارہ تو سابقہ جنایۃ کا تھا اور دوسرا کفارہ دوسری جنایۃ کا ہوگا) ۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے

مطابق مختلف مجالس کی صورت میں چار دم واجب ہوں گے یعنی جب ہر مجلس میں ایک ایک ہاتھ اور ایک ایک پاؤں کے ناخن کاٹے اور ان کفارات میں عبادات کا پہلو نمایاں ہے اور عبادات میں تداخل مناسب نہیں ہوتا . (یہ تداخل تو عقوبات میں ہوتا ہے آج کل بھی عدالتوں میں یہی اصول رائج ہے کہ اگر ایک مجرم کو تین چار قسم کے جرموں کی مختلف المعیاد قید کی سزا ملے تو تمام سزاؤں کا آغاز اکھٹا ہوگا) . البتہ متن میں مذکور صورت میں اتحاد مجلس کی بناء پر ہم نے تداخل کو تسلیم کر لیا تھا . ان کی صورت آیات سجدہ کی سی ہے (کہ اگر ایک آیت سجدہ کو ایک ہی مجلس میں کئی بار دہرائے یا مختلف آیات سجدہ کی تلاوۃ کرے تو اتحاد مجلس کی بناء پر سجدوں میں تداخل ہو جائے گا اور ایک سجدہ ہی کافی ہوگا) .

**مسئلہ** : اگر ایک ہاتھ یا ایک پاؤں کے ناخن کاٹے تو اس پر دم واجب ہوگا کیونکہ حلق ربع رأس کی طرح چوتھے حصے کو کل کے قائم مقام قرار دیا جائے گا.

**مسئلہ** : اگر پانچ ناخنوں سے کم قطع کرے تو اس پر صدقہ ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ناخن کے بدلے الگ صدقہ دے .

امام زفرؒ فرماتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کا پہلا قول بھی یہی ہے کہ تین ناخن کاٹنے پر دم واجب

ہوگا. کیونکہ جب ایک ہاتھ کے ناخن قطع کرنے کی صورت میں دم واجب ہوتا ہے تو "للأکثر حکم الکل" کے اصول کے پیش نظر تین انگلیاں ہاتھ کا اکثر حصہ ہیں.

الجامع الصغیر میں مذکور مسئلے۔ کہ دم واجب نہ ہوگا، صدقہ لازم ہوگا۔کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ کے ناخن وہ کم سے کم مقدار ہے جس کے کاٹنے پر دم لازم آتا ہے اور ہم نے اسے کل کے قائم مقام قرار دیتے ہوئے دم کا حکم دیا تھا. پس ایک ہاتھ کے اکثر حصے کو پورے ہاتھ کے قائم مقام نہ کیا جائے گا. کیونکہ "اقامة للربع مقام الکل" کے اصول کے پیش نظر اس سے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے (یعنی پہلے ہم ایک ہاتھ کو کل کا قائم مقام قرار دے چکے ہیں اب اگر مثلاً چار انگلیوں کو ایک ہاتھ کا اکثر حصہ قرار دیں تو تین انگلیاں چار کا اکثر حصہ ہیں اور دو انگلیاں تین کا اکثر حصہ، تو اس سے لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور آخر ہمیں جزء لا یتجزی تک جانا پڑے گا. اور شریعت بندوں کو ایسے امور کا مکلف نہیں بناتی) .

مسئلہ : اگر دونوں ہاتھوں اور پاؤں کے مختلف پانچ ناخن کاٹے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے میں اس کے ذمے صدقہ ہوگا.

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دم واجب ہوگا کیونکہ

ہم ان پانچ مختلف ناخنوں کو ایک ہاتھ کے ناخن اعتبار کریں گے ۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اگر سر میں مختلف مواضع سے بال کاٹے اور تمام مواضع مل کر ربع رأس کے برابر ہوں تو دم واجب ہوتا ہے ۔ شیخینؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جنایۃ کا دار و مدار راحت اور زیب و زینت کے حصول پر ہے، اور پانچ مختلف ناخنوں کا کاٹنا تو باعث اذیت اور بدصورتی ہے (اذیت اس طرح کہ مثلاً ایک ہاتھ کے دو ناخن کاٹ ڈالے تو مٹھی بند کرتے ہوئے باقیوں سے چبھن محسوس ہوگی) ۔ حلق رأس پر آپ کا قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ اس طرح کے حلق کا رواج بھی تو پایا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے (کہ متعدد علاقوں میں سر کے مختلف حصوں سے بال کاٹے جاتے ہیں) لہذا جب جنایۃ قاصرہ ہے تو صدقہ واجب ہوگا اور ہر ناخن کے بدلے ایک مسکین کا کھانا ہوگا ۔ اسی طرح اگر متفرق طور پر پانچ سے زیادہ ناخن کاٹ دے (تو صدقہ دینا ہوگا) ۔ البتہ اگر صدقے کی مجموعی قیمت دم کی قیمت کے برابر ہو جائے تو صدقے میں حسب منشاء تخفیف کی جا سکتی ہے (مثلاً اگر آٹھ نو متفرق ناخن کاٹ ڈالے اور ہر ناخن کے بدلے گندم کا نصف صاع دے تو ممکن ہے بکری کی قیمت تک جا پہنچے ۔ اس لیے ایسی صورت میں صدقے میں کمی کردے) ۔

**مسئله** : اگر محرم کے ناخن ٹوٹ کر لٹکنے لگے اور وہ اسے الگ کردے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا، کیونکہ ٹوٹ جانے کے بعد اس میں نشو و نما والی صلاحیت باقی نہیں رہی. پس یہ حرم کے خشک ہونے والے درختوں کے مشابہ ہوگا (اور خشک درخت اکھاڑنے کی صورت میں تاوان لازم نہیں آتا).

**مسئله** : اگر کسی عذر کی بناء پر خوشبو استعمال کرے یا سلا ہوا کپڑا پہن لے یا حلق کرے تو اسے تاوان کی ادائیگی میں اختیار ہے. چاہے تو بکری ذبح کردے یا چھ مساکین کو تین صاع طعام دے یا تین دن کے روزے رکھ لے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ** یعنی اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بناء پر اپنا سر منڈالے تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے. کلمہ "**أوْ**" تخییر کے لیے ہوتا ہے. نیز حضور ﷺ نے بھی اس آیۃ کی اسی طرح تفسیر فرمائی ہے. یہ آیۃ ایک معذور شخص کے حق میں نازل ہوئی تھی. (حضرت کعب بن عجرہ حضور ﷺ

کے صحابی تھے . جب آپ ﷺ حدیبیہ کے مقام سے گزرے تو دیکھا کہ کعب ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے ہیں اور جوئیں ان کے سر سے نکل نکل کو چہرے تک آرہی ہیں . فرمایا ! شاید ان جوؤں نے تمہیں بہت پریشان کرر کھا ہے . عرض کیا ، یا رسول اللہ ﷺ ان سے مجھے بڑی اذیت در پیش ہے . آپ ﷺ نے فرمایا کہ سر منڈا دو اور چھ مساکین کو تین صاع طعام دے دو یا تین روزے رکھ لو یا بکری ذبح کر دو) .

روزے رکھنے میں کسی خاص مقام کی کوئی پابندی نہیں جہاں چاہے رکھ سکتا ہے . کیونکہ روزہ ہر جگہ عبادت ہوتا ہے . اور ہمارے نزدیک صدقے کا بھی یہی حکم ہے (کہ جہاں چاہے مساکین میں تقسیم کر دے . امام شافعیؒ مساکین حرم سے تخصیص کرتے ہیں) . چونکہ صدقہ قربت ہے (اس لیے جہاں بھی چاہے اس قربت سے مستفیض ہو سکتا ہے) البتہ قربانی بالاتفاق حرم سے مخصوص ہوگی ، کیونکہ جانور کا ذبح کرنا کسی خاص وقت (مثلاً عید قربان) یا کسی خاص مقام (جیسے ھدایا) ہی میں قربت ہو سکتا ہے اور یہ دم چونکہ کسی معین وقت سے مخصوص نہیں لہذا معین مقام سے مخصوص ہوگا .

مسئلہ : اگر کھانا کھلانے کو ترجیح دے تو امام ابو یوسفؒ کی رائے میں دو وقت یعنی صبح اور

شام کھانا کھلا دینا کافی ہوگا ۔ جیسا کہ کفارۂ یمین میں ہوتا ہے ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کھانا کھلانا کافی نہ ہوگا (بلکہ صدقہ دے) ۔ کیونکہ آیۃ مذکورہ سے تملیک کا پتا چلتا ہے ۔ (اور دعوت دینے میں تملیک نہیں ہوتی ۔ نیز کفارۂ یمین میں چونکہ کھانا کھلانا مذکور ہے لہذا اس پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا) ۔

# فصل

(مصنفؒ نے مختلف الانواع جنایات کو الگ الگ فصلوں میں بیان کیا ہے۔ اس فصل میں ان جنایات کا ذکر ہے جو جماع یا اس کے لوازمات سے واجب ہوتی ہیں)۔

**مسئلہ** : اگر اپنی عورت کی شرم گاہ پر شہوت سے نظر ڈالی اور منی خارج ہوگئی تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔ کیونکہ احرام کے دوران ممنوع امر تو جماع ہے اور مذکورہ صورت میں جماع معدوم ہے۔ پس یہ اس شخص کی طرح ہوگا جو عورت کا تصور کرے اور منی خارج ہو جائے (تو اس صورت میں کوئی تاوان نہیں ہوتا)۔

**مسئلہ** : اگر عورت کو شہوت سے بوسہ دیا یا ہاتھ لگایا تو اس پر دم واجب ہوگا۔ الجامع الصغیر میں اس مسئلے کی صورت یوں بیان کی گئی ہے کہ جب شہوت سے مس کرے اور منی خارج ہو جائے۔ انزال ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں کوئی فرق نہیں۔ یہی بات مبسوط میں بھی مذکور ہے اور فرج کے علاوہ

جماع کرنے کی صورت کا بھی یہی حکم ہے ۔ (یعنی انزال ہو یا نہ ہو دم واجب ہوگا) ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ صورتوں (یعنی تقبیل بشہوۃ ، لمس بشہوۃ اور جماع فیما دون الفرج) میں اگر انزال ہو جائے تو احرام فاسد ہو جائے گا (اور اگر انزال نہ ہو تو کچھ بھی واجب نہ ہوگا) . امام شافعیؒ نے اسے روزے پر قیاس فرمایا ہے . (اگر روزے کی حالت میں مذکورہ صورتوں سے کوئی صورت پائی جائے اور انزال ہو جائے تو روزہ فاسد ہوگا اور اگر انزال نہ ہو تو روزہ صحیح ہوگا) ۔

احنافؒ کہتے ہیں کہ حج اور احرام کے فاسد ہونے کا دار و مدار جماع پر ہے ۔ اسی بناء پر احرام باقی ممنوعات کے ارتکاب سے بھی فاسد نہیں ہوتا . (جیسے سلا ہوا کپڑا پہننا ، خوشبو استعمال کرنا وغیرہ) . نیز یہ امور (یعنی لمس اور تقبیل جب کہ انزال نہ ہو) مباشرۃ مقصودہ نہیں ہیں . لہذا ان کے احکام (حقیقی) جماع کے احکام کی طرح نہ ہوں گے ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شہوۃ سے مس کرنے اور بوسہ دینے میں عورت سے انتفاع اور لطف اندوز ہونا پایا جاتا ہے اور یہ استمتاع اور لطف اندوزی احرام کے دوران ممنوع امور سے ہے ، لہذا دم لازم ہوگا ۔

احناف کہتے ہیں کہ آپ کا اس صورت کو روزے

پر قیاس کرنا درست نہیں . کیونکہ روزے میں قضاء شہوۃ حرام اور ممنوع امر ہے اور فرج سے ماسوا کی صورت میں انزال کے بغیر شہوۃ تکمیل پذیر نہیں ہوتی .

**مسئلہ** : اگر وقوف عرفہ سے پہلے عورت کے احد السبیلین (یعنی فرج یا دبر) میں جماع کر لیا تو حج فاسد ہوگیا . (اسی طرح عورت بھی سعادت حج سے محروم رہے گی) . وہ بکری کی قربانی دے اور حج کے ارکان کو ، اس شخص کی طرح جس کا حج فاسد نہیں ہوتا پورا کرے .

اس مسئلے کی دلیل ابو داؤد کی وہ روایت ہے . جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ میاں بیوی دونوں حج کا احرام باندھے ہوئے تھے اور انھوں نے جماع کا ارتکاب کیا ہے . آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دونوں جانور ذبح کریں . حج کے ارکان کی تکمیل کریں اور آیندہ سال انہیں حج کرنا واجب ہوگا . صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح منقول ہے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں (امام مالکؒ اور امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں) کہ جماع کرنے والے پر بدنہ واجب ہوگا . امام شافعیؒ اس صورت کو اس مسئلے پر قیاس کرتے ہیں کہ اگر وقوف عرفہ کے بعد جماع

کا ارتکاب کرے (تو بدنہ واجب ہوتا ہے۔ لہذا اس صورت میں بھی بدنہ ہی لازم ہوگا)۔

ہماری دلیل مذکورہ بالا روایت ہے۔ اس میں "دم" کا لفظ مطلق ہے۔ (اور مطلق دم بکری پر بھی صادق آتا ہے)۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب جماع کرنے والے پر آیندہ سال حج کی قضاء لازم قرار دی گئی ہے تو اس سے جنایة میں تخفیف ہو جائے گی کیونکہ قضاء کا وجوب استدراک مصلحت کی بناء پر ہی ہوتا ہے۔ لہذا بکری پر ہی اکتفاء کیا جائے گا۔ (یعنی جب آنحضرت ﷺ نے آیندہ سال حج کی قضاء لازم قرار دے دی تو اس میں مصلحت یہ تھی کہ وہ اپنے ضائع شدہ حج کی اصلاح اور فوائد سے بہرہ ور ہوسکیں۔ اس لیے جنایة ہی میں تخفیف ہو جائے گی اور بکری دینے سے کام چل جائے گا) بخلاف اس صورت میں کہ جب وقوف کے بعد جماع کرے (تو بدنہ واجب ہوتا ہے) کیونکہ اس صورت میں قضاء نہیں ہوتی (بلکہ حج پورا ہو جاتا ہے۔ تو اب جنایة میں تخفیف نہ ہوگی اور بدنہ واجب ہوگا)۔

امام قدوریؒ نے متن میں فرج اور دبر کو مساوی حیثیت دی ہے۔ حالیکہ امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ فرج کے علاوہ (دبر میں) جماع سے حج فاسد نہیں ہوتا کیونکہ لواطت کی صورت میں جماع قاصر ہوتا

ہے ۔ تو امام ابو حنیفہؒ سے اس بارے میں دو روایتیں ہوں گی ۔ (پہلی یہ کہ حج فاسد ہو جاتا ہے اور دوسری یہ کہ فاسد نہیں ہوتا) ۔

مسئلہ : ہمارے نزدیک یہ امر ضروری نہیں کہ آیندہ سال میاں بیوی جب حج کی قضاء کو نکلیں تو انہیں (سفر حج میں) الگ الگ کر دیا جائے ، (بلکہ وہ اکھٹا سفر کر سکتے ہیں) ۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب گھر سے نکل پڑیں (تو انہیں سفر میں الگ کر دیا جائے) ۔ امام زفرؒ کا قول ہے کہ جب احرام باندھ لیں (تو انہیں علیحدہ کر دیا جائے) اور امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ جب وہ اس مقام پر پہنچیں جہاں انہوں نے (گزشتہ سال) جماع کیا تھا (تو ان کے سفر میں تفریق کر دی جائے) ۔ امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو انہیں گزشتہ بات پھر یاد آ جائے گی اور ممکن ہے کہ پھر جماع کا ارتکاب کر بیٹھیں ۔ لہذا انہیں الگ الگ کر دیا جائے گا ۔ (ہدایہ کے بعض نسخوں میں لہ کی بجائے لھم ہے ۔ گویا یہ امام مالکؒ ، امام شافعیؒ اور امام زفرؒ تینوں حضرات کی مشترکہ دلیل ہے اور یہی مناسب حال بھی ہے) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جب ان کے درمیان حقیقی جامع اور ارتباط—جسے نکاح کہا جاتا ہے—موجود اور

قائم ہے ، تو ان میں احرام سے پہلے ہی افتراق کرنا ایک بے معنی کام ہے . کیونکہ احرام سے پہلے پہلے جماع کرنا ان کے لیے قطعاً ممنوع نہیں ہے اور نہ احرام کے بعد ہی علیحدگی مناسب ہے کیونکہ یہ امر اچھی طرح ان کے حافظے میں محفوظ ہے کہ (گزشتہ سال) چند لمحات کی لطف اندوزی سے انہیں کس قدر شدید مشقت (صعوبات اور مشکلات) سے دو چار ہونا پڑا ہے . اس لیے ان میں احساس ندامت شدید تر ہوگا اور وہ ایسے فعل کے ارتکاب سے باز رہیں گے . لہذا اب ان میں افتراق پیدا کرنا بے معنی ہے (نیز عورت کے لیے اکیلا رہ کر سفر کرنا کئی پریشانیوں کا باعث ہوسکتا ہے) .

مسئلہ : اگر کسی شخص نے وقوف عرفہ کے بعد (اور حلق سے قبل) جماع کیا تو اس کا حج فاسد نہ ہوگا ، اور اس پر بدنہ کی قربانی واجب ہوگی . امام شافعیؒ کو اس صورت میں اختلاف ہے جب وہ رمی سے پہلے جماع کرے (یعنی امام شافعیؒ کے نزدیک قبل الرمی جماع سے حج فاسد ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی اس کا احرام باقی ہے) .

ہماری دلیل حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے عرفہ میں وقوف کرلیا اس کا حج پورا ہوگیا . (سوال کیا گیا کہ اگر حج مکمل ہو چکا ہے تو پھر آپ بدنہ کی قربانی کیوں واجب قرار دیتے ہیں ؟ اس کا

جواب دیتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں) : البتہ عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے پیش نظر بدنہ واجب ہوگا . (امام مالکؒ سے موطأ میں مروی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ منی میں ایک شخص نے جماع کا ارتکاب کیا ہے تو آپ نے بدنہ کی قربانی کا حکم دیا) . دوسری بات یہ ہے کہ وہ احرام کے دوران اعلیٰ قسم کے انتفاع سے لطف اندوز ہوا ہے . لہذا اس سے مطالبہ بھی شدید ہوگا (کہ بدنہ ذبح کرے اور اسے تاوان میں رعایت نہیں دی جائے گی) .

مسئلہ : اگر حلق کے بعد جماع کرے تو اس پر بکری واجب ہوگی کیونکہ عورتوں سے مباشرت کے حق میں اس کا احرام ابھی باقی ہے . البتہ سلا ہوا کپڑا پہننے اور خوشبو وغیرہ لگانے کی ممانعت زائل ہو چکی ہے . پس یہ جنایۃ قاصرہ ہوگی اور بکری ہی پر اکتفاء کیا جائے گا .

مسئلہ : جس شخص نے طواف عمرہ کے چار چکروں سے پہلے اپنی عورت سے جماع کرلیا اس کا عمرہ فاسد ہوگیا - وہ عمرہ کے افعال کی تکمیل کرے اور عمرے کی قضاء کرے - اور اس پر بکری لازم ہوگی - اگر طواف عمرہ کے چار چکروں کے بعد جماع کیا تو اس کا عمرہ فاسد نہ ہوگا . البتہ اس پر بکری واجب ہوگی -

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں

صورتوں میں عُمرہ فاسد ہوگا اور حج کے فاسد کرنے کے تاوان کی طرح اس پر بدنہ واجب ہوگا ۔ کیونکہ امام شافعی کے نزدیک حج کی طرح عمرہ بھی فرض ہے ۔

احناف کہتے ہیں کہ عمرہ سنت ہے ۔ اس لیے رتبے میں حج سے کم ہوگا ۔ پس عمرے میں بکری واجب ہوگی اور حج میں بدنہ تاکہ دونوں میں تفاوت کا اظہار ہوتا رہے ۔

مسئلہ : بھول کر جماع کرنے والا عمداً جماع کرنے والے کی طرح ہوگا (یعنی بھول کر جماع کرنے سے بھی حج فاسد ہو جائے گا) ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بھول کر جماع کرنے والے کا حج فاسد نہ ہوگا ۔

جس عورت سے سوتے سوتے میں جماع کیا جائے یا جس سے زبردستی جماع کیا جائے اس کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے ۔ (مذکورہ دونوں صورتوں میں ہمارے نزدیک ان کا حج فاسد ہوگا اور امام شافعیؒ کے نزدیک فاسد نہ ہوگا) ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ عوارض (نوم ، نسیان اور اکراہ) کی بناء پر ممنوع فعل کا ارتکاب لازم نہیں آتا ۔ (کیونکہ ان کی نیت اور ارادے کا کوئی دخل نہیں) پس یہ فعل جنایۃ شمار نہ ہوگا ۔

احناف کہتے ہیں کہ احرام کے دوران اسے چونکہ

مخصوص قسم کا انتفاع حاصل ہوا ہے (کیونکہ جماع انتفاع کی سب سے اعلی اور نمایاں صورت ہے) اس لیے حج میں فساد کا ظہور لازم ہے اور ان مذکورہ عوارض کی بناء پر جماع کے اثرات کو معدوم قرار نہیں دیا جا سکتا . (آپ جانتے ہیں کہ اس جماع سے غسل واجب ہوگا اور حرمت مصاہرۃ بھی ثابت ہو جائے گی . اسی طرح حج کے فساد میں بھی مؤثر ہوگا) نیز حج کو صوم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا (کہ جس طرح روزے میں اگر بھول کر جماع کر لیا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا . اسی طرح حج بھی فاسد نہ ہو . احناف کے نزدیک دونوں صورتوں میں نمایاں فرق ہے کیونکہ روزے میں کوئی ایسی واضح حالت یا کیفیت نہیں ہوتی جو روزے دار کو روزے کی یاد دلاتی رہے . اس لیے روزے میں نسیان عذر شمار ہوگا اور روزہ فاسد نہ ہوگا لیکن) حج میں احرام ہی ایک ایسی علامت اور حالت ہے جو اسے حج کی یاد دلاتی رہتی ہے . (لہذا حج میں نسیان عذر شمار نہ ہوگا) جیسا کہ اگر نماز میں بھول کر کھا لے یا پی لے تو نماز فاسد ہو جائے گی . (اور نسیان عذر شمار نہ ہوگا کیونکہ خود نماز ہی ایک ایسی حالت ہے جو اسے یاد دلاتی ہے (کہ وہ نماز میں کھڑا ہے . بیت اللہ کی جانب رخ کیے ہوئے ہے اور دونوں ہاتھ باندھ کر بارگاہ رب العالمین میں حاضر ہے) . واللہ اعلم !

# فصل

(اس فصل میں ان جنایات کا بیان ہے جن کا تعلق طواف وغیرہ سے ہے) .

مسئلہ : جو شخص بے وضو ہونے کی حالت میں طواف قدوم کرے اس پر صدقہ واجب ہوگا . (صدقہ سے مراد نصف صاع گندم ، یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجوریں ہیں) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایسے طواف کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے گا کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ طواف نماز کا درجہ رکھتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالی نے طواف کے دوران بات چیت کو مباح قرار دیا ہے (اور نماز میں ممنوع ہے) لہذا طہارۃ طواف کے لیے شرط ہوگی . (اور مشروط شرط کے سوا نہیں پایا جاتا) .

ہماری دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی ہے . وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ، یعنی لوگوں کو چاہیے کہ اس قدیم گھر کا طواف کریں . اس آیت میں طواف مطلق طور پر وارد ہوا ہے اس کے ساتھ طہارۃ کی کوئی قید نہیں

اس لیے طہارۃ کو فرضیۃ کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔
بعض حضرات نے طہارۃ کو سنت قرار دیا ہے۔ لیکن
صحیح بات یہ ہے کہ واجب ہے۔ کیونکہ اس کے
ترک سے تاوان لازم آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ
خبر واحد سے عمل کا وجوب ثابت ہوتا ہے تو مذکورہ
حدیث "الطواف الصلاۃ" سے طہارت کا وجوب ثابت ہوگا۔

طواف اگرچہ اصل کے لحاظ سے سنت ہے، لیکن
شروع کرنے سے واجب ہو جائے گا اور ترک طہارۃ
سے قصور لازم آئے گا۔ صدقہ دے کر اس قصور کی
تلافی کی جائے گی۔ تاکہ اس بات کا اظہار بھی ہوتا
رہے کہ طواف قدوم طواف زیارت سے—جسے اللہ تعالی
نے واجب قرار دیا ہے—رتبے میں کم ہے۔ (یعنی
طواف زیارت کو اللہ تعالی نے واجب ٹھیرایا ہے اور
طواف قدوم انسان خود شروع کرنے سے اپنے اوپر
واجب کرتا ہے لہذا طواف زیارت کا رتبہ طواف قدوم
سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔ اسی بناء پر بے وضو طواف
زیارت میں بکری اور بے وضو طواف قدوم میں صدقہ
واجب ہوتا ہے)۔ اور ہر اس طواف کا جو نفل کی حیثیت
رکھتا ہو یہی حکم ہے (کہ اگر حدث کی حالت میں
کیا جائے تو صدقہ واجب ہوگا)۔

مسئلہ : اگر طواف زیارت حالت حدث میں کرے
تو بکری واجب ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں اس نے

رکن میں کوتاہی کی ہے اور یہ پہلے قصور سے زیادہ نمایاں اور فاحش ہے. لہذا تاوان کے طور پر دم واجب ہوگا.

مسئلہ: اگر حالت جنابۃ میں طواف کرے تو بدنہ واجب ہوگا. حضرت ابن عباسؓ سے ایسے ہی مروی ہے. دوسری بات یہ ہے کہ جنابۃ حدث سے کہیں بڑھ کر جنایۃ ہے. لہذا اس نقصان اور قصور کی تلافی بدنہ سے ہوگی. تاکہ جنابۃ اور حدث کا تفاوت نمایاں ہو جائے.

اسی طرح جب طواف کا اکثر حصہ جنابۃ یا حدث کی حالت میں کرے تو یہی حکم ہوگا. کیونکہ چیز کے اکثر حصے کو کل کے قائم مقام شمار کیا جاتا ہے. افضل یہ ہے کہ جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم ہے طواف کا اعادہ کرلے اور اس کے ذمے سے قربانی ساقط ہو جائے گی.

امام قدوری کے بعض نسخوں میں **"وعلیه أن یعید الطواف"** ہے. یعنی اس پر واجب ہے کہ طواف کا اعادہ کرے. لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حدث کی صورت میں طواف کے اعادے کا حکم استحبابی طور پر دیا جائے گا.

اور جنابۃ کی صورت میں ایجابی طور پر کہا جائے گا

(کہ وہ طواف کا اعادہ کرے) کیونکہ جنابة کے ساتھ طواف کرنے میں قصور بہت نمایاں اور فاحش ہے اور حدث کی حالت میں قصور اتنا زیادہ نہیں ہوتا.

جب اس طواف کا۔جسے حدث کی حالت میں کرچکا ہے۔اعادہ کرلے تو اس پر ذبح لازم نہ ہوگا. خواہ طواف کا اعادہ ایام نحر کے بعد ہی کرے. کیونکہ اعادے کے بعد تو نقصان کا کوئی شائبہ ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے. (اعادے سے قصور کا ازالہ ہو جاتا ہے).

اگر اسی طواف کا۔جسے جنابة کے ساتھ کیا ہے۔ ایام نحر میں اعادہ کرلے تو اس کے ذمے کوئی تاوان نہ رہے گا. کیونکہ اس نے مناسب وقت میں اعادہ کرکے تلافی کر لی ہے. اگر ایام نحر کے بعد اعادہ کرے تو امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے پیش نظر اس پر دم واجب ہوگا. کیونکہ اس نے اعادے میں تأخیر کی ہے. (امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ کسی نسک کی تقدیم یا تأخیر سے دم واجب ہوتا ہے).

مسئلہ : اگر جنابة کی حالت میں طواف کرے اور اپنے اہل و عیال میں واپس آجائے، تو اس پر مکہ مکرمہ لوٹ کر آنا ضروری ہوگا کیونکہ کوتاہی اور قصور بہت نمایاں ہے اس لیے اسے واپس آنے کو کہا جائے گا تاکہ فاسد ہونے والے طواف کی تلافی کر سکے اور اب کے نیا احرام باندھ کر آئے گا. اگر خود

واپس نہ آئے اور بدلہ بھیج دے تو کافی ہوگا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ بدنہ سے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے ۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ خود لوٹ کر آئے اور نقصان کی تلافی کرے ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے حدث کی حالت میں طواف کیا اور اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ گیا ۔ لیکن پھر واپس آ کر اعادہ کرلیا تو جائز ہوگا اور اگر بکری بھیج دی (اور خود نہ آیا) تو یہ بہتر صورۃ ہے ۔ کیونکہ قصور معمولی نوعیت کا تھا اور بکری بھیجنے میں فقراء اور مساکین کی منفعت کا پہلو نمایاں ہے ۔

مسئلہ : اگر طواف زیارت بالکل ہی نہ کیا اور اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ گیا تو اس پر واجب ہے کہ اسی احرام کے ساتھ واپس آئے کیونکہ اس کے لیے احرام کھولنے کا جواز نہیں ہے اور جب تک طواف نہ کرے اس کے لیے عورتوں سے مباشرت ہمیشہ کے لیے ممنوع رہے گی ۔

مسئلہ : جو شخص طواف صدر حدث کی حالت میں کرے تو اس پر صدقہ واجب ہوگا ۔ اگرچہ طواف صدر واجب ہے لیکن یہ رتبے میں طواف زیارت سے کم ہے ۔ لہذا دونوں میں تفاوت کا اظہار ضروری ہوگا ۔ (یعنی طواف زیارت رکن ہے اور طواف صدر واجب ہے ۔ رکن کے سلسلے میں جنایۃ کا تاوان دم سے ہوگا اور

واجب کے حق میں صدقے سے) امام ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ اس پر بکری واجب ہوگی۔ مگر پہلی بات زیادہ صحیح اور مناسب ہے۔

مسئلہ: اگر طواف صدر جنابۃ کی حالت میں کرے تو اس پر بکری واجب ہوگی۔ کیونکہ بحالت جنابۃ طواف کرنے میں نقصان کثیر ہے۔ (لیکن بدنہ واجب نہ ہوگا کیونکہ) یہ طواف زیارت سے کم رتبہ ہے۔ لہذا بکری پر ہی اکتفاء کیا جائے گا۔

مسئلہ: جو شخص طواف زیارت کے تین یا اس سے کم چکر چھوڑ دے اس پر بکری واجب ہوگی کیونکہ تھوڑے چکروں کے ترک کرنے کی بناء پر قصور میں بھی کمی آ جاتی ہے۔ پس یہ حالت حدث میں طواف کرنے کے نقصان کے مشابہ ہوگا۔ لہذا بکری لازم ہوگی۔ اگر اہل و عیال کی طرف لوٹ جائے تو جائز ہے کہ خود مکہ مکرمہ واپس نہ آئے اور بکری بھیج دے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ: اور جو شخص طواف زیارت کے چار چکر چھوڑ دے وہ اس وقت تک حالت احرام ہی میں رہے گا جب تک کہ طواف کی ادائیگی نہ کرے کیونکہ متروک حصہ اکثر ہے تو گویا کہ اس نے طواف کیا ہی نہیں۔

**مسئلہ** : اور جو شخص طواف صدر بالکل ہی چھوڑ دے یا چار چکر ترک کر دے تو اس پر بکری واجب ہوگی ۔ کیونکہ اس نے یا تو پورے کا پورا واجب چھوڑ دیا ہے یا اس کا اکثر حصہ ۔ لہذا وہ جب تک مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہے اسے اعادہ کرنے کو کہا جائے گا تاکہ ایک واجب امر سے مناسب وقت میں عہدہ برآ ہو سکے ۔

**مسئلہ** : اگر کوئی شخص طواف صدر کے تین چکر چھوڑ دے تو اس پر صدقہ واجب ہوگا ۔ (اسے ہر چکر کے بدلے گندم کا نصف صاع دینا ہوگا) ۔

**مسئلہ** : اور جو شخص طواف واجب (یعنی جس کا وجوب سنت سے ثابت ہے) حطیم کے اندر سے کرے اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو تو اپنے طواف کا اعادہ کرے کیونکہ طواف کرتے وقت حطیم کو طواف میں شامل کرنا واجب ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں (یعنی اَلْحَطِيْمُ مِنَ الْبَيْتِ) ۔

حطیم کے اند سے طواف کی صورت یہ ہے کہ کعبہ کے گرد چکر لگائے اور ان دو راستوں یعنی کھلی جگہوں کے درمیان سے ہو کر گزرے جو کعبہ اور حطیم کے درمیان ہیں (شکل میں ان جگہوں کو ا اور ج سے ظاہر کیا گیا ہے) ۔ اس طرح طواف کرنے سے طواف میں قصور لازم آئے گا ۔ لہذا جب تک مکہ مکرمہ
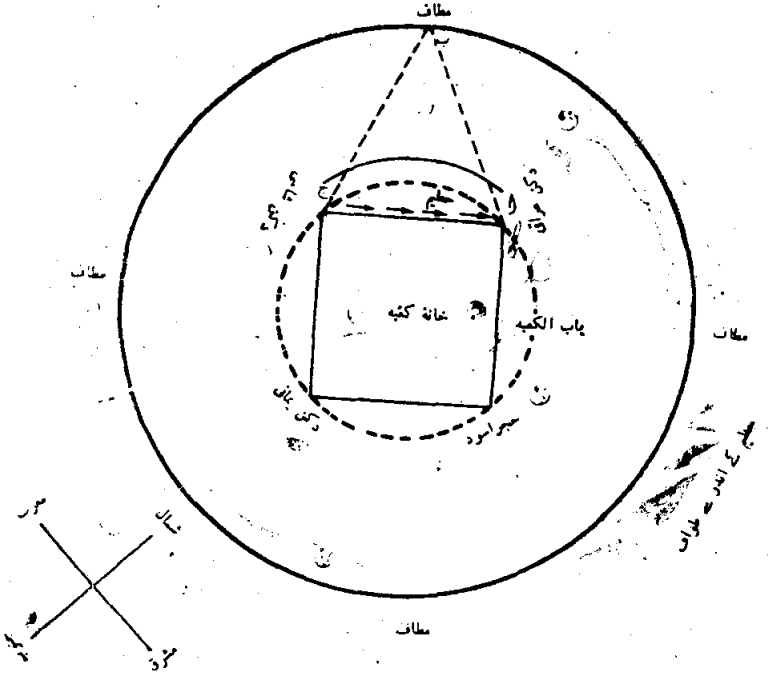
میں اقامت پذیر ہے طواف کا اعادہ کرے تاکہ طواف کی ادائیگی مشروع طریق پر ہو جائے.

(اعادے کے وقت) اگر صرف حطیم تک سات چکر لگائے تو کافی ہوگا. کیونکہ اس نے متروک امر کی تلافی کر دی. اس کی صورت یوں ہوگی کہ حطیم کے باہر دائیں جانب سے شروع کرے اور اس کے آخر تک پہنچ جائے. پھر کھلی جگہ سے حطیم کی طرف آئے اور دوسری جانب سے نکل جائے اور اس طرح سات بار

کرے ۔ (یعنی پچھلے طواف میں جس قدر جگہ ترک کی تھی وہاں سات چکر لگائے ۔ نقشے کو ملاحظہ کریں ۔ مقام ا سے پہلا چکر شروع کرے اور مقام ب پر پہنچے ۔ پھر مقام ب سے ج تک آئے اور پھر ا کی طرف واپس لوٹے اور اس طرح سات مرتبہ کرے تو اس کا سابقہ طواف تکمیل پذیر ہوگا ۔ یعنی حطیم کی جو جگہ سابقہ طواف میں رہ گئی تھی ، اب اس کے گرد چکر لگا کر اس نے سابقہ طواف کی تلافی کر دی) ۔

**مسئلہ** : اگر طواف کا اعادہ کیے بغیر اہل و عیال کی طرف لوٹ جائے تو اس پر دم واجب ہوگا ۔ چونکہ اس نے تقریباً چوتھائی جگہ کا طواف چھوڑ دیا تھا اس لیے اس کے طواف میں نقصان باقی ہے لہذا صدقہ دینا کافی نہ ہوگا (بلکہ اس نقصان کی تلافی دم سے ہوگی) ۔

**مسئلہ** : جس شخص نے طواف زیارت حدث کی حالت میں کیا اور طواف صدر طہارت کی حالت میں ایام تشریق کے آخر میں کیا ۔ تو اس پر ایک دم واجب ہوگا ۔ اور اگر طواف زیارت جنابۃ کی حالت میں کرے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر دو دم واجب ہوں گے ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں اس پر ایک ہی دم واجب ہوگا ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی صورت میں (جب کہ طواف زیارت حدث کی حالت میں کیا ہو) طواف صدر طواف زیارت کی طرف منتقل نہیں ہوگا . کیونکہ طواف صدر واجب ہوتا ہے اور طواف زیارت کا اعادہ — جب کہ حالت حدث میں کیا گیا ہو — واجب نہیں ہوتا ، بلکہ مستحب ہوتا ہے . لہٰذا طواف صدر منتقل ہو کر طواف زیارت کی جگہ نہ لے گا . (اگر طواف زیارت کالعدم قرار دیا جاتا ؛ تب طواف صدر اس کی جگہ منتقل ہو جاتا . حدث کی حالت میں طواف کرنے کی بناء پر ایک دم ہی واجب ہوگا) .

دوسری صورت میں (جب کہ طواف زیارت جنابة کی حالت میں کرے) طواف صدر طواف زیارت کی جگہ منتقل ہو جائے گا . کیونکہ (جنابت کی بناء پر) طواف زیارت کا اعادہ واجب ہے (یعنی جنابت کی بناء پر طواف زیارت کالعدم قرار پائے گا اور طواف صدر اس کی جگہ لے لے گا اور اس صورت میں دو قصور لازم آتے ہیں) - ایک یہ کہ وہ طواف صدر کا تارک ہوگا اور دوسرے یہ کہ طواف زیارت کی ایام تشریق سے تأخیر لازم آئے گی . (یعنی امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے مطابق تأخیر سے دوسرا دم واجب ہوگا) .

پس طواف صدر کے ترک پر بالاتفاق اس پر دم واجب ہوگا اور طواف زیارت کی تأخیر کی وجہ سے دم

کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ (یعنی امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے مطابق تأخیر سے بھی دم واجب ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک واجب نہ ہوگا)۔ البتہ جب تک وہ مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہے اسے اعادہ کرنے کو کہا جائے گا اور اگر مکہ مکرمہ سے واپس چلا گیا تو اسے لوٹ کر آنے کا حکم نہ دیا جائے گا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

**مسئلہ** : جو شخص طواف عمرہ اور سعی حدث کی حالت میں کرے اور احرام کھول دے، تو جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم ہے دونوں کا اعادہ کرلے اور اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔ طواف کا اعادہ اس نقصان کی بناء پر کرے جو حدث کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا ہے اور سعی کا اعادہ اس لیے کہ وہ طواف کے تابع ہوتی ہے (جب متبوع میں نقص پایا گیا تو تابع میں بھی نقص موجود ہوگا)۔ جب دونوں کا اعادہ کرے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا، کیونکہ نقصان کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

اگر طواف و سعی کے اعادہ سے پہلے ہی گھر لوٹ جائے تو ترک طہارت کی بناء پر اس پر دم واجب ہوگا اور اسے مکہ مکرمہ واپس آنے کا حکم نہ دیا جائے گا، کیونکہ رکن (یعنی طواف و سعی) کی ادائیگی کی بناء پر وہ حالت احرام سے نکل چکا ہے کیونکہ نقصان

خفیف قسم کا تھا اور (بے وضو) سعی کرنے کے سلسلے میں اس پر کوئی شے واجب نہیں کیونکہ اس نے سعی کو معتد بہ طواف کے بعد ادا کیا ہے۔ اگر طواف کا اعادہ کرے اور سعی کا اعادہ نہ کرے تو بھی صحیح قول کے مطابق اس پر کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

مسئلہ : اور جو شخص صفا و مروہ کے درمیان سعی چھوڑ دے تو اس پر دم واجب ہوگا اور اس کا حج صحیح ہوگا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک سعی امور واجبہ سے ہے اور اس واجب کے ترک پر دم لازم ہوتا ہے فساد واقع نہیں ہوتا۔

مسئلہ : اور جو شخص امام سے پہلے ہی عرفات سے لوٹ آئے تو اس پر دم واجب ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

احناف کہتے ہیں کہ غروب شمس تک وہاں ٹھیرنا اور قیام کرنا واجب ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد واپس لوٹا کرو۔ لہذا واجب اس کے ترک پر دم لازم ہوگا۔ (سوال : مذکورہ حدیث سے پتا چلتا ہے کہ غروب شمس کے بعد واپس لوٹ آنا چاہیے اور وہاں رات بھر قیام کرنے میں مخالفت حدیث لازم آتی ہے۔ لہذا اگر کوئی رات بھر وہاں قیام کرے تو اس پر دم لازم ہونا چاہیے۔ صاحب ھدایہ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ)

جب رات بھر وہاں قیام کرے (تو دم واجب نہ ہوگا) کیونکہ غروب شمس تک وقوف کی استدامت اور طوالت اس شخص کے لیے ضروری ہے جو دن کو وہاں قیام کرے . رات کو اسی وقت واپس آنا ضروری نہیں کہ ترک واجب سے دم لازم ہو .

اگر غزوب شمس کے بعد پھر عرفات میں لوٹ کر آ جائے تو ظاہر الروایۃ کے مطابق دم ساقط نہ ہوگا . کیونکہ اب امر متروک کی تلافی نہیں ہو سکتی (امام کے ساتھ لوٹنا سنت ہے اور جب ایک بار ترک سنت کر چکا ہے تو اب واپس آنے سے سنت کی ادائیگی ممکن نہ رہی) . اور جب غروب شمس سے پہلے پہلے لوٹ آئے تو اس صورت میں بھی اختلاف ہے . (علماء ثلاثہ کے نزدیک دم ساقط ہو جائے گا اور امام زفرؒ سقوط کے قائل نہیں) .

**مسئلہ** : جو شخص مزدلفہ میں وقوف نہ کرے اس پر دم واجب ہوگا ، کیونکہ مزدلفہ امور واجبہ سے ہے .

**مسئلہ** : اور جو شخص تمام ایام کی رمی ترک کر دے تو اس پر دم واجب ہوگا . کیونکہ اس نے امر واجب کو ترک کیا ہے اور اسے ایک دم ہی کافی ہوگا (یہ نہیں کہ ہر جمرہ کی رمی کے لیے ایک دم واجب ہو) ، کیونکہ جنس متحد ہے جیسا کہ حلق کی

صورت میں ہوتا ہے (کہ اگر تمام بدن کے بال منڈا دے تو ایک دم ہی واجب ہوگا) . رمی کے آخری دن سورج غروب ہونے پر ترک محقق اور یقینی ہو جائے گا ، کیونکہ کنکر مارنا صرف مخصوص ایام ہی میں قربت کا درجہ رکھتا ہے ؛ اور جب تک رمی کے ایام باقی ہیں اعادے کا امکان موجود ہے کہ ترتیب کے مطابق رمی کرے .

امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے پیش نظر تأخیر کی بناء پر دم واجب ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک واجب نہ ہوگا .

مسئلہ : ایک دن کی رمی کے ترک پر دم واجب ہوگا ، کیونکہ یہ ایک مکمل نسک ہے .

**مسئلہ :** جو شخص تین جمروں میں سے ایک جمرے کی رمی چھوڑ دے تو اس پر صدقہ واجب ہوگا (یعنی ہر کنکر کے بدلے گندم کا نصف صاع) ، کیونکہ اس دن کے تمام جمرے نسک واحد کی حیثیت رکھتے ہیں ، اور متروک حصہ قلیل ہے . ہاں اگر متروک حصہ نصف سے زائد ہو (مثلاً گیارہ کنکر چھوڑ دے اور دس مارے) تو اس صورت میں اکثر حصہ چھوڑنے کی بناء پر دم لازم آئے گا .

**مسئلہ :** اگر نحر کے دن جمرۂ عقبہ کی رمی چھوڑ

دے تو اس پر دم واجب ہوگا ، کیونکہ اس نے پورے دن کی رمی کا فریضہ ترک کیا ہے . (نحر کے دن اس کے ذمے ایک ہی رمی ہوتی ہے) . اسی طرح اگر اکثر حصہ ترک کر دے (تو دم واجب ہوگا) .

**مسئلہ** : اگر ایک ، دو یا تین کنکریاں چھوڑ دے تو ہر کنکری کے عوض گندم کا نصف صاع بطور صدقہ ادا کرے . ہاں اگر گندم کی قیمت دم کی قیمت تک پہنچ جائے تو صدقے میں حسب منشاء کمی کرسکتا ہے ، کیونکہ متروک حصہ قلیل ہے اس لیے اسے صدقہ دینا ہی کافی ہوگا .

**مسئلہ** : جس شخص نے حلق میں اتنی تأخیر کر دی کہ ایام نحر گزر گئے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس پر دم واجب ہوگا . اسی طرح طواف زیارت کی تأخیر کی صورت میں بھی (امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دم لازم ہوگا) .

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ دونوں صورتوں (یعنی تأخیر حلق اور تأخیر طواف زیارت) میں کوئی شے واجب نہ ہوگی) .

صاحبینؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان ان تمام صورتوں میں اختلاف موجود ہے جس میں کسی نسک کی تقدیم یا تأخیر پائی جائے . مثلاً رمی میں تأخیر

کر دے، یا کسی نسک کو دوسرے نسک پر مقدم کر دے مثلاً رمی سے پہلے حلق کرے، یا قارن رمی سے پہلے جانور ذبح کر دے یا ذبح سے پہلے حلق کرے۔

صاحبینؒ کا کہنا ہے کہ فوت شدہ امر کی تلافی قضاء سے ہو سکتی ہے اور قضاء کی صورت میں اس کے علاوہ کوئی شے واجب نہیں ہوا کرتی۔ امام ابو حنیفہؒ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ جو کسی نسک کو دوسرے نسک پر مقدم کر دے تو اس پر دم واجب ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی ایسے فعل کو جو کسی مکان یا جگہ سے مخصوص ہو، اس مخصوص مقام سے مؤخر کر دیا جائے تو دم واجب ہوتا ہے، جیسا کہ احرام۔ (احرام میقات سے مخصوص ہے۔ اگر وہاں احرام نہ باندھے تو دم واجب ہوگا)۔ اسی طرح کسی ایسے فعل کو جو کسی معین وقت سے مخصوص ہے اپنے مخصوص وقت سے مؤخر کر دیا جائے تو دم واجب ہوگا۔

**مسئلہ** : اور جو شخص ایام نحر میں حرم کی حدود میں حلق نہ کرے اس پر دم واجب ہوگا اور جو شخص عمرہ کرکے حدود حرم سے نکل جائے اور قصر کرے تو امام ابو حنیفہؒ، اور امام محمدؒ، کے نزدیک اس پر دم واجب ہوگا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ الجامع الصغیر میں امام محمدؒ نے عمرہ کرنے والے کے بارے میں امام ابو یوسفؒ کا قول نقل کیا ہے اور حج کرنے والے کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

بعض فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ حج کرنے والے کے بارے میں وجوب دم میں فقہاء ثلاثہ متفق ہیں۔ کیونکہ حج میں سنة جاریہ یہی ہے کہ منی ہی میں، جو حدود حرم کا حصہ ہے، حلق کرایا جائے۔

لیکن صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اختلاف موجود ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حلق حدود حرم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا تھا اور انہوں حدود حرم سے باہر حلق کرایا تھا۔

طرفین کا استدلال یہ ہے کہ حلق احرام کے لیے اسی طرح محلل ہے جس طرح سلام نماز کے لیے محلل ہے، اور سلام اگرچہ محلل ہے مگر واجبات نماز میں سے ہے۔ (جس طرح حلق محلل احرام بھی ہے اور واجبات حج سے بھی ہے)۔ جب (بوجہ وجوب) حلق کا نسک ہونا ثابت ہوگیا تو حرم سے مخصوص ہوگا جیسا کہ ذبح (اور دیگر تمام مناسک حرم سے مخصوص ہیں)۔

رہا مقام حدیبیہ کا مسئلہ تو آپ کو معلوم ہے کہ حدیبیہ کے بعض حصے حرم کی حدود میں داخل ہیں اور ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اسی حصے میں فریضۂ حلق ادا فرمایا ہو ۔

الحاصل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلق زمان (ایام نحر) اور مکان (حرم) دونوں سے مخصوص ہے ۔

امام ابو یوسفؒ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی اختصاص کے قائل نہیں (حتی کہ اگر غیر ایام نحر اور غیر حرم میں حلق کرے تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا) ۔

امام محمدؒ اختصاص مکان کے قائل ہیں اختصاص زمان کے نہیں ۔ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ زمان سے مخصوص ہے مکان سے نہیں ۔ اختصاص کا یہ مذکورہ اختلاف دم کے وجوب یا عدم وجوب کے بارے میں ہے ۔ تحلل (یعنی احرام کھولنے کے جواز) کے بارے میں کوئی بھی اختصاص کا قائل نہیں ۔ (یعنی جہاں کہیں اور جب بھی حلق کرائے گا احرام کھولنا مباح ہے) ۔

عمرے میں قصر اور حلق بالاجماع کسی وقت سے مخصوص نہیں کیونکہ عمرہ اپنے اصل کے لحاظ سے کسی معین وقت سے مخصوص نہیں ہوتا ۔ (بلکہ سال کے تمام اوقات میں جب چاہے عمرہ سے مستفیض ہو سکتا ہے) ۔ البتہ عمرہ مکان کے ساتھ مخصوص ہے ، (کیونکہ

عمره طواف اور سعی سے عبارت ہے اور طواف اور سعی کے لیے مقام مخصوص ہیں) .

**مسئلہ** : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر قصر نہ کرے ، حتی کہ پھر لوٹ کر آئے اور قصر کرے تو سب کے نزدیک اس پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا . اس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کرنے والا شخص ایک بار حرم کی حدود سے نکل جائے اور پھر لوٹ کر آنے پر قصر کرے تو اس پر تاوان لازم نہ ہوگا ، کیونکہ اس نے حرم ہی میں حلق یا قصر کر لیا . (اگر حج کرنے والا حدود حرم سے نکل جائے اور ایام نحر کے بعد لوٹ کر آئے اور حلق کرائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تأخیر کی بناء پر دم واجب ہوگا) .

**مسئلہ** : اگر قارن ذبح سے پہلے حلق کرالے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس پر دو دم واجب ہوں گے ، ایک تو غیر اوقات میں حلق کرانے پر کیونکہ حلق کا صحیح وقت ذبح کے بعد ہے ، اور دوسرا دم ذبح کو حلق سے مؤخر کرنے پر .

صاحبینؒ کے نزدیک اس پر ایک دم واجب ہوگا اور وہ پہلا ہے (یعنی غیر صحیح اوقات میں حلق کرانا) . اور صاحبینؒ کے اصول کے مطابق تأخیر کی بناء پر کوئی شے واجب نہ ہوگی جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں .

## فصل

(اس فصل میں ان جنایات کا بیان ہے جن کا تعلق شکار سے ہے) .

**مسئلہ** : اچھی طرح جان لیجیے کہ محرم کے لیے خشکی کا شکار حرام ہے اور سمندر کا شکار حلال ہے . اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا .** (: تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا . جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زاد راہ بھی بنا سکتے ہو . البتہ خشکی کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں ہو تم پر حرام کیا گیا ہے) . خشکی کے شکار سے وہ جانور مراد ہے کہ جس کا مولد و مسکن خشکی ہو ، اور سمندری شکار سے مراد وہ جانور ہے جس کا مولد و مسکن پانی ہو. لفظ "صید" سے مراد وہ جانور ہے جو اپنی خلقت اور فطرت کے لحاظ سے اپنی حفاظت خود کر سکتا ہو (مثلاً بھاگ کر یا اڑ کر) اور اس میں وحشت پائی جاتی ہو . نبی اکرم ﷺ نے پانچ ایسے جانوروں کو اس حکم

سے مستثنی قرار دیا ہے جو باعث اذیت ہیں ۔ کاٹنے والا کتا ، بھیڑیا ، چیل ، کوا ، سانپ اور بچھو ۔ کیونکہ یہ جاندار (بغیر تعرض کے بھی) انسان کو اذیت پہنچاتے ہیں ۔ کوے سے مراد مردار خور کوا ہے ۔ امام ابو یوسف سے ایسے ہی مروی ہے ۔

مسئلہ : امام قدوری فرماتے ہیں کہ جب محرم شکار کے جانور کو قتل کرے یا اس شخص کی راہنمائی کرے جو اسے قتل کر دے تو محرم پر جزاء واجب ہوگی ۔ شکار کا قتل کرنا اللہ تعالی کے مندرجہ ذیل ارشاد کی بناء پر ممنوع ہے ۔

**يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ أَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِيَذُوْقَ وَبَالَ أَمْرِهِ** (: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو احرام کی حالت میں شکار نہ مارو ۔ اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے ، اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا ، یا نہیں تو اسے گناہ کے کفارہ میں چند مسکینوں

کو کھانا کھلانا ہوگا ، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے تا کہ وہ اپنے کیے کا مزا چکھے) . اور یہ آیت جزاء کے ایجاب میں نص ہے . دلالت اور راہنمائی کرنے کے بارے میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے . وہ فرماتے ہیں کہ جزاء کا تعلق قتل سے ہوتا ہے اور دلالت کو قتل نہیں کہا جا سکتا . پس اس کی صورت ایسے ہی ہے کہ کوئی غیر محرم کسی غیر محرم کی شکار کے سلسلے میں راہنمائی کرے ، (تو اس صورت میں قاتل پر جزاء ہوتی ہے دلالت کرنے والے پر نہیں ہوتی) .

ہماری دلیل حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد رشید حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں : اس امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ راہنمائی کرنے والے پر بھی جزاء ہے . دوسری بات یہ ہے کہ احرام کے دوران دلالت کرنا امر ممنوع ہے . نیز دلالت اور راہنمائی کی وجہ سے جانور کی حالت امن میں خلل آتا ہے ، حالانکہ وہ اپنے وحشی پن اور چھپ کر رہنے کی بناء پر مامون ہوتا ہے .

اس لیے دلالت اتلاف کے قائم مقام ہوگی کیونکہ محرم جب احرام باندھتا ہے تو وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے کہ وہ کسی (جانور) سے تعرض تک نہ کرے گا اور اس التزام کے ترک کی صورت میں تاوان کا لازم آنا

ضروری ہے جیسا کہ ودیعت میں ہوتا ہے ۔ (مثلاً زید نے بکر کے پاس اپنا مال امانت رکھا ۔ بکر نے کسی چور سے ذکر کر دیا کہ زید کا اتنا مال میرے پاس بطور ودیعت پڑا ہے ۔ چور نے موقع دیکھ کر مال چرا لیا تو اب بکر مال کا ذمہ دار ہوگا ۔ کیونکہ حفاظت کا ذمہ اس کا تھا اور اس نے اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کی ۔ نیز اس کی دلالت کا بھی اس میں دخل ہے) ۔

بخلاف اس صورت کے جب کہ ایک غیر محرم دوسرے غیر محرم کی راہنمائی کرے ۔ کیونکہ اس صورت میں غیر محرم دال پر کسی چیز (یعنی تعرض نہ کرنے) کی ذمہ داری کا التزام نہیں ہوتا ۔ نیز امام ابو یوسفؒ اور امام زفرؒ سے مروی ہے کہ اس صورت میں بھی دلالت کرنے والے پر جزاء لازم ہوتی ہے ۔ (لہذا امام شافعیؒ کا غیر محرم والی صورت پر قیاس کرنا درست نہ رہا) ۔

وہ دلالت جس سے دال پر جزاء واجب ہوتی ہے اس صورت میں ہے کہ مدلول کو شکار کی جگہ کا علم نہ ہو ۔ (اگر مدلول کو پتا ہو کہ شکار کہاں چھپا ہوا ہے تو دال پر جزاء نہ ہوگی) ۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مدلول دال کی راہنمائی کی تصدیق بھی کرے ، حتی کہ اگر مدلول نے دلالت کرنے والے کی بات یا اشارے کو جھٹلا دیا اور کسی دوسرے کی بات کو

تسلیم کیا تو جھٹلائے گئے دال پر جزاء نہ ہوگی (بلکہ دوسرے دال پر ہوگی) .

اگر دلالت کرنے والا غیر محرم حرم میں ہو (اور شکار کے لیے کسی کی راہنمائی کرے) تو بھی اس پر کوئی شے واجب نہ ہوگی . جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں . (کہ اس نے اپنے ذمے کوئی التزام نہیں کیا) .

مسئلہ : عمداً دلالت کرنے والا اور بھول کر دلالت کرنے والا وجوب جزاء کے لحاظ سے برابر ہیں . کیونکہ جزاء ایسی ضمانت ہے . جس کا وجوب اتلاف کی بناء پر ہوتا ہے . لہذا یہ ضمانت اموال کی ضمانتوں کی طرح ہوگی . (اگر کسی کا مال کسی کے پاس بطور امانت پڑا ہو اور اس سے عمداً یا بغیر ارادے کے ضائع ہو جائے تو وہ مال کا ضامن ہوگا) .

مسئلہ : پہلی بار شکار کرنے والا اور دوسری بار شکار کرنے والا دونوں جزاء کے لحاظ سے برابر ہیں . کیونکہ ضمانت کے وجوب کا سبب (یعنی اتلاف) دونوں صورتوں میں مختلف نہیں ہے ، (بلکہ یکساں ہے) . اور قرآن کریم کے اس ارشاد کو بھی ملاحظہ کیجیے :

وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللهُ مِنْهُ . اگر غور سے دیکھا جائے تو اس فعل کے دوبارہ ارتکاب کرنے میں جرم کی نوعیت شدید ہو جاتی ہے . (لہذا اگر دوبارہ شکار کرے گا تو معاوضہ دے گا) .

**مسئلہ :** امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جزاء کی صورت یہ ہے کہ جس مقام پر شکار کو قتل کیا گیا ہے اسی مقام پر اس کی قیمت لگائی جائے (ساتھ ہی مقامی حالات اور مقامی بھاؤ وغیرہ مدنظر ہوں گے)، یا کسی قریبی موضع میں جا کر قیمت لگوائی جائے جب کہ شکار جنگل میں کیا گیا ہو۔ (یعنی اگر جنگل میں قیمت کا اندازہ نہ لگایا جا سکے تو کسی قریبی گاؤں میں جا کر قیمت لگوائی جائے)۔ دو عادل شخص اس کی قیمت کا تعین کریں گے۔

(قیمت کے تعین کے بعد) قاتل کو اختیار حاصل ہوگا کہ اگر چاہے تو اس قیمت کا جانور ذبح کر دے بشرطیکہ اس قیمت میں جانور خرید جا سکتا ہو؛ یا اگر چاہے تو اس قیمت کے عوض طعام خرید کر مساکین میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ہر مسکین کو گندم کا نصف صاع یا جو یا کجھوروں کا ایک صاع مل سکے؛ یا اگر چاہے تو روزے رکھ لے۔ اس کی تفصیل ہم آیندہ اوراق میں بیان کریں گے۔

امام محمدؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس جانور کی نظیر ملنی ممکن ہے اس کے شکار کے عوض نظیر ہی واجب ہوگی۔ مثلاً ہرن کے عوض بکری اور کفتار (بجو) کے عوض میں بھی بکری ہوگی۔ خرگوش کے عوض بکری کا بچہ۔ چوہے کے بدلے بھیڑ کا چار ماہ

کا بچہ ، شتر مرغ کے بدلے بدنہ ، گورخر کے عوض گائے ہوگی کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ**. اور جانوروں میں مثل وہ ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے مقتول کے مشابہ ہیں . کیونکہ قیمت کو "نَعَم" یعنی جانور نہیں کہا جاتا . نیز صحابہ کرامؓ خلقت کے لحاظ سے ہی نظیر واجب کیا کرتے تھے . اس اصول کے تحت شتر مرغ ، ہرن ، گورخر اور خرگوش کی جو نظیریں ہم نے بیان کی ہیں دیکھنے میں کس قدر مشابہ ہیں .

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ کفتار (بجو) شکار ہے اور اس کے عوض بکری واجب ہوگی .

اور جن جانوروں کی نظیر نہ مل سکے تو امام محمدؒ کے نزدیک ان کی قیمت واجب ہوگی جیسے چڑیا ، کبوتر اور ان کے مشابہ مثلاً قمری اور فاختہ وغیرہ . قیمت کے واجب کرنے کی صورت میں امام محمدؒ کا قول شیخینؒ کے مطابق ہوگا ، (کیونکہ وہ بھی قیمت کے قائل ہیں .

امام شافعیؒ کبوتر کے بدلے میں بکری مقرر کرتے ہیں ، اور دونوں میں مشابہت اس طرح کرتے ہیں کہ دونوں (کبوتر اور بکری) منہ لگا کر ایک سانس ہی میں پانی پیتے ہیں ، نیز دونوں کی آواز میں بھی مماثلت ہے .

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ (قرآن کریم میں وارد) "مثل" کا لفظ مطلق ہے جس سے مراد یا تو صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے مثل ہے . مگر ان معنوں پر حمل کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے (کیونکہ کسی وحشی جانور کی صحیح مثل شہر یا گاؤں میں کیسے مل سکتی ہے) لہذا اس سے مراد معنوی لحاظ سے مثل ہوگا ، کیونکہ امور شرعیہ میں مثل معنوی ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے جیسا کہ حقوق العباد میں ، (مثلاً اگر کوئی شخص کسی کا کپڑا ضائع کر دے تو اس پر قیمت کی ادائیگی واجب ہوگی) . نیز تمام امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ آیت میں مثل سے مراد قیمت ہے جب کہ نظیر کا ملنا مشکل ہو) . تیسری بات یہ ہے کہ مثل معنوی میں عموم پایا جاتا ہے اور اس کی ضد (یعنی صوری) میں تخصیص پائی جاتی ہے . (یعنی اللہ تعالی کے ارشاد میں کہ اس کی مثل جزاء دو ، عموم ہے . یعنی اگر صوری مثل نہ مل سکے تو مثل معنوی ادا کرو . اور اگر آپ کی بات مانی جائے تو آیت میں تخصیص ہو جاتی ہے . نیز بعض جانوروں کی مثل ھی موجود نہیں تو وہ اس آیت کے حکم سے خارج ہوں گے . لہذا مشہور اصول فقہ کے پیش نظر — کہ آیت کے عموم کی بلاوجہ تخصیص نہ کی جائے — ہم آیت کو اپنے عموم پر باقی رکھیں گے اور مثل معنوی یا قیمت کو جزاء قرار دیں گے) .

چوتھی بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یوں ہوگا۔
فَجَزَاءٌ قِیْمَۃ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ الْوَحْشِ ، یعنی وحشی جانور کے قتل کے جزاء کی قیمت ہے۔ [اس کا ایک اور جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ ''مِنَ النَّعَم'' میں امام شافعیؒ نے من کو مثل بیان بنایا ہے۔ لیکن یہ من بیانیہ ما قتل کا بیان ہے اور اس صورت میں امام شافعیؒ کا استدلال صحیح نہیں رہتا]۔

(شیخینؒ نے نص کا جو مطلب بیان کیا ہے کہ فَجَزَاءٌ قِیْمَۃ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ الْوَحْشِ۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ نعم کا لفظ تو اہلی یعنی پالتو جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور پالتو جانور کے قتل پر کچھ واجب نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) کہ نعم صرف اہلی جانوروں کے لیے خاص نہیں۔ بلکہ اہلی اور وحشی دونوں قسم کے جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ ابو عبیدہؒ اور امام اصمعیؒ سے اسی طرح منقول ہے (اور یہ دونوں حضرات علم لغت کے امام ہیں)۔

آپ کی پیش کردہ حدیث "الضبع صید وفیہ الشاۃ" سے مراد یہ ہے کہ کفتار کی قیمت کا اندازہ بکری کی قیمت سے لگایا جا سکتا ہے۔ بکری کی تعیین مراد نہیں (کہ عوض میں صرف بکری کا دینا ہی واجب ہو)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جانور خریدنے یا طعام خریدنے یا روزے رکھنے سمیت اختیار قاتل کو حاصل ہے. (کہ ان میں سے ایک کام کرے).

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اختیار حکمین کو حاصل ہوگا. اگر حکمین جانور کا فیصلہ کریں تو پھر نظیر کی ادائیگی ہمارے اصول کے مطابق کی جائے گی ، اور اگر وہ طعام یا روزوں کا فیصلہ دیں تو پھر قیمت کا حساب ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق لگایا جائے گا.

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ تخییر اس شخص کی رعایت کے مدنظر مشروع ہے جس پر جزاء کا بوجھ پڑ رہا ہے ، اس لیے اختیار بھی اسے ہی حاصل ہوگا جیسا کہ قسم کے کفارے میں ہوتا ہے (کہ کفارہ دینے والے کو اختیار حاصل ہوتا ہے) .

امام محمدؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کے ارشاد **يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا** میں **"هَدْيًا" يحكم به** کی تفسیر کی بناء پر منصوب ہے . (یعنی به میں ھاء مجمل ہے . اس کا مشار إلیه معلوم نہیں . ھدیا سے اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی گئی . اور معنی یوں ہوگا : **يحكم به ذوا عدل منكم بالهدى** . تو اس سے پتا چلا کہ مثل کا حکم ، حکم اور اس کے اختیار

سے ثابت ہوگا) . یا "هدیا" حکم کا مفعول ہے اور آیة کے معنی یوں ہوں گے : **یحکم به ذوا عدل منکم حکم هدی** (یعنی ذوی عدل هدیہ کا حکم دیں). پھر طعام اور صیام کا ذکر ہے جس کا لفظ "او" کے ساتھ هدی پر عطف کیا گیا ہے . اس لیے طعام و صیام کا اختیار بھی حکمین کو ہوگا .

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف ان دلائل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت مبارکہ میں کفارۃٌ کا عطف جزاءٌ پر ہے هَدْیاً پر نہیں ہے . (اس لیے کفارہ یحکم بہ کے تحت داخل نہ ہوگا ، کیونکہ اس کا عطف جزاء پر ہے اور وہ یحکم بہ سے مقدم ہے . لہذا اختیار کا تعلق ذوی عدل سے نہ ہوگا) . ہمارے بیان کردہ مسئلے (کہ عطف جزاء پر ہے) کی دلیل یہ ہے کہ لفظ کفارہ مرفوع ہے (اور جزاء معطوف علیہ بھی مرفوع ہے) . اور اسی طرح اللہ تعالی کا ارشاد **وَعَدْلُ ذٰلِكَ صِيَاماً** بھی مرفوع ہے ، (اس کا عطف طعام پر ہے)، لہذا طعام اور صیام میں حکمین کا اختیار ثابت کرنے کے لیے کوئی دلالت نہیں ہے . (اور جب ان دو میں ثبوت اختیار معدوم ہے تو تیسرے یعنی هدی میں خود بخود باقی نہ رہے گا ورنہ قول بالفصل لازم آئے گا) .

حکمین کے ذمے تو صرف ہلاک شدہ جانور کی

قیمت کا تعین کرنا ہوگا . قیمت کے تعین کے بعد اختیار تو اس شخص کو حاصل ہوگا جو تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے .

مسئلہ : حکمین اسی جگہ پر قیمت کا تعین کریں گے جہاں اس نے جانور کو قتل کیا ہے ، کیونکہ مقامات کے اختلاف سے قیمتیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں . اگر شکاری کی جگہ جنگل اور غیر آباد مقام ہو جہاں شکار کی خرید و فروخت ہی نہ ہوتی ہو تو اس سے قریب ترین آبادی کا اعتبار ہوگا جہاں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے .

مشایخ کا کہنا ہے کہ قیمت کے تعین کے لیے ایک آدمی بھی کافی ہے (کیونکہ یہ معاملہ خبر کے زمرے میں آتا ہے . شہادت نہیں ہے کہ دو گواہ ضروری ہوں اور ایک عادل کی خبر قبول کی جا سکتی ہے) . لیکن بہتر یہ ہے کہ دو آدمی ہوں کیونکہ یہ احتیاط کے زیادہ قریب ہے اور غلطی کا امکان باقی نہیں رہتا جیسا کہ حقوق العباد میں ہوتا ہے (کہ کسی پر حق وغیرہ ثابت کرنے کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے) . بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نص کتاب کے پیش نظر دو آدمیوں کا اعتبار ہوگا (اور جن حضرات نے دو کا ہونا ضروری قرار نہیں دیا ، ان کے نزدیک دو کا عدد اولیت پر محمول ہے) .

مسئلہ : ہدی کو سوائے مکہ مکرمہ یعنی حرم کے اور کہیں ذبح نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : هَدْيًا بَالِغَ الكعبة (کعبہ سے مراد حرم ہے) .

مسئلہ : کھانا مکہ مکرمہ کے علاوہ اور جگہ بھی کھلایا جا سکتا ہے . (یعنی یہ ضروری نہیں کہ کھانا بھی حدود حرم ہی میں کھلائے) . امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے؛ وہ اطعام کو ہدی پر قیاس فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ مساکین حرم کو وسعت اور فارغ البالی حاصل ہو .

احناف کہتے ہیں کہ جانور کی قربانی دینا غیر قیاسی عبادت ہے ، لہذا یہ کسی مکان یا زمان سے مخصوص ہوگی . اور صدقہ معقول اور قیاسی عبادت ہے ، جہاں کہیں بھی ہو اور جب بھی ہو) لہذا صدقہ کسی مکان یا زمان سے مخصوص نہ ہوگا) . اسی طرح روزے بھی مکہ مکرمہ کے علاوہ جائز ہیں لیکن روزے ہر مکان میں قربت اور عبادت کا درجہ رکھتے ہیں .

مسئلہ : اگر (مکہ مکرمہ کے علاوہ مثلاً) کوفہ میں جانور ذبح کرے تو کھانا کھلانے کے قائم مقام ہوگا . اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سارا گوشت صدقہ کر دے بشرطیکہ گوشت کی مقدار طعام کی قیمت

کے برابر ہو (یعنی ہر مسکین کو اس قدر گوشت دے کہ اس کی قیمت گندم کے نصف صاع کی قیمت کے برابر ہو) کیونکہ غیر حرم میں خون بہانا کفارے یعنی ھدی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا .

**مسئله** : اگر قاتل ھدی کو ترجیح دے تو ہر وہ جانور دیا جا سکتا ہے جو قربانی میں دینا جائز ہو . کیونکہ جب ھدی کا لفظ مطلق استعمال کیا جائے تو اس سے یہی جانور مراد ہوتے ہیں . یعنی جو جانور عمر اور دوسری شرائط کے لحاظ سے قربانی کے کام آ سکتے ہیں) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ھدی میں چھوٹے جانور بھی دیے جا سکتے ہیں . صحابہ کرامؓ نے بکری اور بھیڑ کا چھوٹا بچہ بھی ھدی کے طور پر واجب کیا تھا .

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چھوٹا جانور اطعام کے طور پر دینا ، جب کہ صدقہ کر دیا جائے ، جائز ہے .

**مسئله** : اگر قاتل طعام دینا پسند کرے تو ہمارے نزدیک ہلاک شدہ جانور کی قیمت طعام کے لحاظ سے لگائے . (یعنی یہ ضروری نہیں کہ پہلے دراہم سے قیمت کا تعین کرے پھر ان دراہم کا طعام خریدے . بلکہ بلا واسطہ طور پر طعام سے بھی قیمت لگائی جا سکتی

ہے کہ ہلاک شدہ جانور مثلا پندرہ صاع گندم کے برابر ہوگا) ، کیونکہ جب ہلاک شدہ جانور کا تاوان دینا ہے تو اسی کی قیمت کا اعتبار ہوگا .

جب (شکار کی) قیمت کا طعام خریدے تو ہر مسکین کو گندم کا نصف صاع یا جو کا ایک صاع یا کھجوروں کا ایک صاع دے . مسکین کو نصف صاع سے کم طعام دینا جائز نہیں . کیونکہ آیت میں مذکور طعام سے مراد شرعی طور پر مقرر کردہ طعام ہی ہوگا . (اور یہ مقدار نصف صاع ہے . جیسا کہ صدقۂ فطر ، کفارۂ یمین اور کفارہ ظہار میں دیا جاتا ہے) .

**مسئلہ** : اگر قاتل صیام کو ترجیح دے تو مقتول کی قیمت طعام کے حساب سے متعین کی جائے اور گندم کے ہر نصف صاع کے بدلے یا جو اور کجھوروں کے ایک ایک صاع کے بدلے ایک دن کا روزہ رکھے . (اگر جانور کی قیمت مثلاً سات صاع گندم کے برابر ہو تو چودہ دن کے روزے رکھے) . چونکہ روزوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اس لیے مقتول سے صیام کی مقدار کا اندازہ ممکن نہیں . لہذا طعام کے ذریعے روزوں کا اندازہ لگایا جائے گا اور اسی طرح روزوں کا طعام سے اندازہ لگانا شرعی طور پر معہود بھی ہے . جیسا کہ فدیہ کے باب میں (کہ شیخ فانی ہر صوم کے بدلے گندم کا نصف صاع فدیے کے طور پر دے) .

اگر (صدقہ کرنے کے بعد) طعام کی نصف صاع سے کم مقدار باقی رہ جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ بچا ہوا طعام صدقہ کر دے ، یا اس کے بدلے میں ایک کامل دن کا روزہ رکھ لے . کیونکہ پورے دن سے کم کا روزہ مشروع ہی نہیں . (کہ اگر صاع کا چوتھائی بچے تو اس کے لیے نصف دن کا روزہ بنتا ہے مگر روزہ ہمیشہ کامل دن کا ہوتا ہے) .

اسی طرح قیمت اگر طعام مسکین سے کم واجب ہو (مثلا چڑیا یا چوہے کے مارنے پر ایک سیر گندم قیمت لگائی جائے جو ایک مسکین کے طعام کی مقدار سے کم ہے) ، تو (اپنی طرف سے اضافہ کرکے مقدار واجب کو پورا کر دے (اور مسکین کو نصف صاع ہی دے) یا پورے دن کا روزہ رکھے . جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں .

مسئلہ : اگر شکار کے جانور کو زخمی کرے ، یا اس کے بال اکھاڑے ، یا اس کا کوئی عضو کاٹ دے تو نقصان کے مطابق تاوان دے گا . نقصان کے جزء کو کل پر قیاس کریں گے (یعنی اگر پورے جانور کے تلف کرنے سے تاوان لازم ہوتا ہے تو اس کے بعض اعضاء کے تلف پر وہی تاوان لازم ہوگا) . جیسا کہ حقوق العباد میں ہوتا ہے (کہ اگر کسی انسان کے مملوکہ جانور کا کوئی عضو ضائع کر دیا جائے تو اس پر تاوان واجب

ہوتا ہے ۔ جیسا کو پورے جانور کو تلف کرنے کی صورت میں ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : اگر پرندے کے پر اکھاڑ کر یا شکار کے جانور کے پاؤں کاٹ کر انہیں حفاظت خود اختیاری سے محروم کرے ، (یعنی نہ تو پرندہ اڑ کر اپنا بچاؤ کرسکے اور نہ ہی جانور بھاگ کر اپنے آپ کو بچاسکے) تو اس پر پورے پرندے یا جانور کی قیت واجب ہوگی ، کیونکہ اس نے ان کے حفاظت خود اختیاری کے ذرائع اور آلات کو معدوم کر دیا ہے ، (اب وہ اپنی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں) تو یہ شخص پوری جزاء کا ضامن اور ذمہ دار ہوگا ۔

مسئلہ : اور جو شخص شتر مرغ کا انڈہ توڑ دے تو اس پر اس کی قیمت واجب ہوگی ۔ ابن عباس رض اور حضرت علی رض سے ایسے ہی روایت کی گئی ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ انڈا صید کی بنیاد اور اصل ہے اور انڈے میں شکار کا جانور بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے ؛ لہذا انڈے کو صید کے قائم مقام قرار دیا جائے گا بشرطیکہ انڈہ گندہ نہ ہو ، (کیونکہ گندے انڈے میں جانور بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی) ۔

مسئلہ : اگر انڈے سے مردہ چوزہ برآمد ہو تو اس کی قیمت واجب ہوگی ۔ یہ وجوب قیمت استحسان کے طور پر ہے ۔ ورنہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ انڈے

کی قیمت کو واجب کیا جائے ، کیونکہ چوزے کی زندگی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا . (ممکن ہے کہ وہ انڈا ٹوٹنے سے پہلے ہی مر چکا ہو) . استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اصل کے لحاظ سے انڈے میں اس بات کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اس سے زندہ چوزہ برآمد ہو اور وقت سے پہلے توڑ ڈالنا شاید اس کی موت کا سبب ہو . اور محتاط صورت یہی ہے کہ موت کا سبب انڈا توڑنے ہی کو قرار دیا جائے .

اسی احتیاط کے مد نظر اس صورت میں بھی یہی فیصلہ ہوگا کہ اگر ہرنی کے پیٹ پر ضرب لگائے اور مردہ بچہ باہر نکل آئے اور ہرنی بھی مر جائے تو مارنے والے پر دونوں کی قیمت واجب ہوگی .

**مسئلہ** : کوے ، چیل ، بھیڑیے ، سانپ ، بچھو ، چوہے اور کاٹنے والے کتے کو مارنے کی صورت میں کوئی جزاء نہ ہوگی . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ پانچ موذی جانور حل و حرم میں قتل کیے جا سکتے ہیں : کوا ، چیل ، بچھو ، سانپ اور کاٹنے والا کتا . نیز بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ محرم چوہے ، کوے ، چیل ، بچھو ، سانپ اور کاٹنے والے کو قتل کر سکتا ہے . بلکہ بعض روایات میں تو بھیڑیے کا ذکر بھی ہے . بعض نے کہا ہے کہ کلب عقود سے مراد بھیڑیا ہے .

یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معنوی لحاظ سے بھیڑیا بھی کاٹنے والے کتے کی طرح اذیت ناک ہے .

غراب سے مراد وہ کوا ہے جو مردار کھاتا ہے اور حرام و حلال کو ملا دیتا ہے (یعنی کبھی دانے کھاتا ہے کبھی نجاست) ، کیونکہ کوا بھی اذیت دینے میں ہمیشہ پہل کرتا ہے . لیکن جنگلی کوا ان مذکورہ پانچ مستثنیات میں شامل نہیں کیونکہ اسے غراب نہیں کہا جاتا (بلکہ اسے عقعق کہتے ہیں) اور وہ کسی کو تکلیف دینے میں بھی پہل نہیں کرتا . امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ کاٹنے والا اور نہ کاٹنے والا کتا ، مانوس اور وحشی کتا سب برابر ہیں کیونکہ حقیقت جنس کا اعتبار کیا جاتا ہے . (اور جنس کے لحاظ سے سب کتے برابر ہیں) .

اسی طرح گھریلو چوہا اور جنگلی چوہا بھی برابر ہیں . البتہ گوہ (سوسمار) اور جنگلی چوہا مذکورہ پانچ مستثنیات میں شامل نہیں کیونکہ وہ تکلیف پہنچانے میں پہل نہیں کرتے .

مسئلہ : مچھر ، چیونٹی ، کھٹمل اور چیچڑی کے مارنے کی صورت میں کچھ واجب نہ ہوگا کیونکہ یہ شکار کی نوع سے خارج ہیں اور کسی بدن یا جسم سے پیدا نہیں ہوتے . اور یہ جانور طبعی طور پر اذیت ناک بھی ہیں . اور نمل سے مراد سیاہ اور زرد رنگ کی وہ چیونٹیاں

ہیں جو انسان کو کاٹتی ہیں ۔ اور جو چیونٹیاں انسان کو کاٹتی ہی نہیں ان کا مارنا جائز نہ ہوگا ۔ لیکن اگر مار دے تب بھی جزاء نہ ہوگی ۔ اس کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں (کہ شکار کی نوع میں داخل نہیں) ۔

**مسئلہ** : جو شخص جوں کو مارے وہ حسب منشاء صدقہ کر دے مثلاً مٹھی بھر گندم ۔ کیونکہ وہ اس میل کچیل سے پیدا ہوتی ہیں جو انسان کے بدن پر ہوتی ہے ۔ الجامع الصغیر میں اَطْعَمَ شَیْئًا کے الفاظ مذکور ہیں ۔ جن کا مطلب یہ ہے ۔ کہ برسبیل اباحت کسی مسکین کو تھوڑا سا کھانا کھلا دینا بھی کافی ہے ۔ خواہ اس سے مسکین کا پیٹ نہ بھرے ۔ (یعنی قدوری میں صدقہ کا لفظ ہے جس میں تملیک ضروری ہوتی ہے اور الجامع الصغیر میں اطعام کا لفظ ہے جو اباحت کے لیے استعمال ہوا ہے) ۔

**مسئلہ** : اور جو شخص مکڑی کو مارے حسب منشاء صدقہ کر دے ، کیونکہ اس کا تعلق خشکی کے شکار سے ہے ۔ ”صید“ اسے کہا جاتا ہے کہ جسے حیلے اور تدابیر کے سوا پکڑا نہ جا سکے اور پکڑنے والے کا ارادہ اور قصد بھی ہو ۔ اور ایک مکڑی کے بدلے ایک کھجور دے دے ۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک کھجور ایک مکڑی سے اچھی ہے (اس لیے

مکڑی کے مارنے کی صورت میں کھجور صدقے میں دی جا سکتی ہے) .

**مسئلہ** : کچھوے کو ذبح کرنے کی صورت میں کچھ لازم نہ ہوگا . کیونکہ زہریلے جانوروں اور حشرات الارض کی قبیل سے ہے . پس یہ گبریلے اور چھپکلی کے مشابہ ہوگا کیونکہ اسے کسی حیلے یا تدبیر کے بغیر پکڑا جا سکتا ہے اور پکڑنے سے کوئی خاص مقصد بھی متعلق نہیں ہوتا . لہذا شکار میں داخل نہ ہوگا .

**مسئلہ** : جو شخص حرم کے شکار کا دودھ دوہے اس پر دودھ کی قیمت واجب ہوگی . کیونکہ دودھ بھی شکار کا جزء ہے ، اس لیےکل کے مشابہ ہوگا .

**مسئلہ** : اور جو شخص شکار میں ایسا جانور مارے جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا . جیسے درندہ (شیر ، چیتا وغیرہ) یا اس کی مثل (باز ، شکرہ) تو اس پر جزاء ہوگی . کیونکہ شریعت نے انہیں مذکورہ مستثنیات میں شامل نہیں کیا . حدیث پہلے بیان کی جا چکی ہے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جزاء واجب نہ ہوگی ، کیونکہ یہ جانور اپنی جبلت اور فطرت کے لحاظ سے مؤذی ہیں ، لہذا یہ مذکورہ مستثنیات میں داخل ہوں گے . اسی طرح لفظ کلب لغوی طور پر تمام درندوں پر شامل ہوگا. (حضور ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے

حق میں بد دعاء کی تھی : اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْهِ کَلْبًا مِنْ کِلَابِكَ،
تو اسے درندے نے پھاڑ کھایا تھا) .

احناف کہتے ہیں کہ درندہ اپنے وحشی پن کی وجہ سے صید شمار ہوگا اور اس کے شکار کرنے میں قصد اور ارادہ بھی شامل ہوتا ہے ، کیونکہ انہیں یا تو قیمتی کھال کے حصول کے لیے پکڑا جاتا ہے . (شیر اور چیتے کی کھال بیش قیمت چیز ہوتی ہے) ، یا ان کے ساتھ شکار کھیلا جاتا ہے ، یا انہیں دفع ایذاء کے لیے مارا جاتا ہے اور مذکورہ پانچ فواسق پر قیاس کرنا درست نہیں ، کیونکہ اس سے منصوص عدد (پانچ) کا ابطال لازم آتا ہے .

عرف عام میں لفظ کلب درندے کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور الفاظ کے استعمال میں عرف کی حیثیت زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے . (عتبہ بن ابی لہب کے بارے میں کلب مجاز کے طور پر استعمال ہوا ہے) .

(درندے کو مارنے کی صورت میں جزاء کا تعین کرتے ہوئے یہ خیال رکھا جائے کہ تاوان کی مقدار) بکری کی قیمت سے متجاوز نہ ہو . امام زفرؒ فرماتے ہیں . مأکول اللحم جانور پر قیاس کرتے ہوئے قیمت جہاں تک پہنچتی ہے پہنچتی رہے) .

ہماری دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ

کفتار یعنی بجو صید ہے اور اس کے بدلے بکری واجب ہوگی ۔ دوسری بات یہ کہ غیر مأکول اللحم کی قیمت کا اعتبار اس لحاظ سے ہے کہ اس کی جلد قیمتی اور سود مند ہوتی ہے ۔ اس بناء پر نہیں کہ وہ حملہ کرنے والا اور مؤذی ہے اور اس ظاہری پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی قیمت کو بکری کی قیمت سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے ۔

**مسئلہ** : اگر درندہ محرم پر حملہ کرے اور محرم اسے قتل کر دے تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی ۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ حملہ آور اونٹ پر قیاس کرتے ہوئے جزاء واجب ہوگی (یعنی اگر اونٹ کسی انسان پر حملہ کر دے اور وہ انسان اپنے بچاؤ کی خاطر اسے مار ڈالے تو اونٹ کا مالک مارنے والے سے قیمت وصول کرے گا) ۔

ہماری دلیل حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ ہے کہ انھوں نے درندے کو قتل کیا تھا ۔ اس لیے مینڈھا بطور ھدی دیا تھا اور ساتھ ہی فرمایا تھا کہ اس کے مارنے میں ابتداء ہم نے کی تھی ۔ (اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر وہ حملہ کرتا اور مار دیا جاتا تو کچھ واجب نہ ہوتا) ۔ دوسری بات یہ ہے کہ محرم کے لیے شکار سے تعرض کرنا تو ممنوع ہے مگر کسی ایذاء سے اپنے آپ کو بچانے کی ممانعت نہیں ۔ اور اسی بناء پر اس کے لیے

جائز ہے کہ اگر کسی درندے کی طرف سے حملے کا خدشہ ہو تو پہل کرکے اسے مار سکتا ہے۔ جیسا کہ فواسق کی صورت میں (محض ایذاء کے خدشہ کے مد نظر ہی ان کا مارنا جائز ہے)، لیکن جب درندے نے واقعی حملہ کر دیا ہو تو اس صورت میں اسے مارنے کی اجازت بطریق اولی حاصل ہوگی۔ اور جب شارع کی طرف سے اجازت موجود ہے تو حق شرع کے مد نظر جزاء واجب نہ ہوگی۔

امام زفرؒ کا حملہ آور اونٹ پر قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ مارنے والے کو صاحب حق یعنی بندے کی طرف سے مارنے کی اجازت حاصل نہیں ہوتی۔

مسئلہ : محرم اگر قتل صید پر مجبور ہوگیا اور اس نے شکار کو مار دیا تو اس پر جزاء ہوگی۔ (مجبور ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسے کوئی دوسرا شخص مجبور کرے یا بھوک کی بناء پر خود اضطرار کی حالت تک پہنچ جائے)، کیونکہ اس نص سے جو فصل کے ابتداء میں درج کی گئی ہے پتا چلتا ہے (یعنی مَنْ قَتَلَ کے الفاظ سے شکار کے اذن کا ثبوت ملتا ہے لیکن) یہ اذن کفارے کے ساتھ مقید ہے۔ (مطلق اذن نہیں ہے)۔

مسئلہ : محرم کے لیے بکری، گائے، اونٹ، مرغی اور پالتو بطخ کے ذبح کرنے میں کوئی حرج

نہیں کیونکہ ان جانوروں میں وحشت نہیں ہوتی ، لہذا یہ جانور شکار کے زمرے میں شامل نہ ہوں گے . بطخ سے مراد وہ بطخ ہے جو لوگوں کے گھروں اور حوضوں میں رہتی ہے کیونکہ وہ اپنی خلقت کے لحاظ سے انسانوں کے ساتھ مانوس ہو جاتی ہے .

مسئلہ : اگر مسرول کبوتر ذبح کرے تو اس پر جزاء واجب ہوگی . (کبوتروں کی دو قسمیں ہیں ، ایک وہ جن کی ٹانگوں پر بال نہیں ہوتے اور یہ بڑے تیز رفتار ہوتے ہیں اور صید میں داخل ہیں . دوسرے وہ جو مسرول ہوتے ہیں . ان کی ٹانگوں پر اس قدر بال ہوتے ہیں ، گویا انھوں نے سلوار پہن رکھی ہے . یہ کبوتر سست رفتار اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں . ان کی سستی کی وجہ سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید وہ صید کے زمرے میں داخل نہ ہوں . امام قدوریؒ نے اس شبہے کا ازالہ کر دیا) .

امام مالکؒ وجوب جزاء کے قائل نہیں ، وہ فرماتے ہیں کہ مسرول کبوتر انسانوں سے بہت زیادہ مألوف اور مانوس ہوتے ہیں اور سست رفتاری کی بناء پر اڑ کر بھی اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے (انھیں آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے . لہذا مسرول کبوتر صید میں شامل نہ ہوں گے) .

احناف کہتے ہیں کہ کبوتر اپنی خلقت اور جبلت کے لحاظ سے وحشی پرندہ ہے . اگرچہ وہ اڑنے میں سست ہوتا ہے . مگر اپنے پروں کے ذریعے (اڑ کر) اپنا بچاو تو کر سکتا ہے . (لہذا صید کے زمرے میں شامل ہوگا) . اور اس کا انس عارضی ہوتا ہے ، لہذا وہ قابل اعتبار نہ ہوگا . (جیسے ہرن اور اڑیال لوگوں نے گھروں میں پال رکھے ہوتے ہیں اور وہ مانوس ہو جاتے ہیں . تو کیا ہرن صید نہیں ہے ؟)

اسی طرح پالتو ہرن کے قتل کرنے میں بھی جزاء واجب ہوگی . کیونکہ وہ اصل خلقت کے لحاظ سے صید ہے اور اس کا صید ہونا عارضی استیناس کی بناء پر باطل نہ ہوگا ، جیسے کہ اونٹ اگر بھگوڑا ہو جائے تو بھی اس کا مارنا محرم کے لیے حرام ہوتا ہے . (یہ نہیں کہ بھگوڑے پن کی وجہ سے وہ صید کے زمرے میں شامل ہوگیا ہو ، بلکہ وہ اپنی خلقت کے لحاظ سے پالتو جانور ہی میں شمار ہوگا) .

مسئلہ : اگر محرم شکار ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ مردار شمار ہوگا اور اس کا کھانا حلال نہ ہوگا . امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ محرم کا ذبیحہ دوسرے کے لیے جائز ہوگا ، کیونکہ محرم کا یہ عمل دوسرے کے لیے ہے (خود اس کے لیے نہیں) . پس محرم کا فعل اسی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گا (اور

محرم کی حیثیت ایک آلے کی سی ہوگی) .

ہم کہتے ہیں کہ ذبح کرنا ایک مشروع فعل ہے . مگر محرم کا ذبح کرنا مشروع فعل نہیں ، بلکہ حرام فعل ہے ، تو اسے مجوسی کے ذبیحہ کی طرح ”ذبح کرنا“ قرار نہیں دیا جائے گا . اور محرم کے مذبوح کا حرام ہونا اس بناء پر ہے کہ مشروع وہ امر ہے جو سہولت اور آسانی کے پیش نظر خون اور گوشت کے درمیان تمیز کے قائم مقام ہو . لیکن مشروعیت کے معدوم ہونے کی بناء پر ذبح کی تمیز بننے کی صلاحیت بھی مفقود ہوگی (یعنی جانور کا خون حرام ہوتا ہے اور گوشت حلال . اور ذبح گوشت اور خون کو علیحدہ کر دیتا ہے . یعنی جب بسم اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے تو خون بدن سے خارج ہو جاتا ہے اور جو تھوڑا بہت گوشت کے ساتھ رہ جاتا ہے ، وہ بسم اللہ سے پاک ہو جاتا ہے . الحاصل ذبح خون اور گوشت کو الگ الگ کر دیتا ہے . لیکن محرم کے لیے ذبح کرنا ہی مشروع نہ رہا . تو یہ خون اورگوشت کےدرمیان تمیز کا قائم مقام نہیں ہوسکتا . لہذا ذبیحہ مردار ہوگا).

**مسئلہ** : اگر محرم اپنے ذبیحہ سے کچھ کھالے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس قدر اس نے کھایا ہے اس کی قیمت واجب ہوگی . صاحبینؒ کہتے ہیں کہ قیمت واجب نہ ہوگی .

اگر اس سے کوئی دوسرا محرم کھالے تو بالاتفاق اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ صاحبینؒ مذکورہ مسئلے کی (کہ محرم اپنے ذبیحہ سے کھالے) وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب محرم نے جو کچھ بھی کھایا ہے مردار تھا، تو اس کے کھانے سے سوائے استغفار کے، کچھ بھی واجب نہ ہوگا اور اس کی صورت یہ بن جائے گی، گویا کہ کھایا ہی دوسرے محرم نے تھا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حرمت اس کے مردار ہونے کی بناء پر ہے جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ احرام کے دوران شکار کا ذبح کرنا ممنوع تھا، کیونکہ یہ اس کا احرام ہی تو ہے جس نے شکار کو حلت سے خارج کر دیا ہے اور ذابح کو ذبح کرنے کی اہلیت سے محروم کر دیا ہے؛ پس تناول یعنی کھانے کی حرمت ان وسائط اور ذرائع کے سبب اس کے احرام کی طرف مضاف اور منسوب ہوگی۔ (یعنی مذبوح کا مردار بن جانا، شکار کا حلت سے خارج ہونا اور ذابح کا اہلیت ذبح سے محروم ہونا، یہ ایسے وسائط ہیں جن کی بناء پر حرمت کا تعلق احرام سے ہوگا، اور جب اس سے کچھ کھالے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس نے احرام کی حالت میں ایک جنایة کا ارتکاب کر لیا۔ لہذا یہ قیمت جنایة کا عوض ہوگی)۔ بخلاف دوسرے محرم کے اگر مذبوح سے کچھ کھانا اس

کے لیے بھی حرام ہے (جو گناہ کا سبب ہے)، مگر اس پر قیمت واجب نہ ہوگی کیونکہ اس کا کھانا اس کے احرام کے ممنوعات سے نہیں ہے۔

مسئلہ: اور اس امر میں کوئی ہرج نہیں کہ محرم اس شکار کا گوشت کھالے جسے غیر محرم نے شکار کیا ہو اور ذبح بھی اسی نے کیا ہو، اور نہ ہی کسی محرم نے اس کی راہنمائی کی ہو، اور نہ شکار کرنے کا حکم دیا ہو۔

امام مالکؒ کا اس صورت میں اختلاف ہے جب کہ غیر محرم نے اسی محرم کو کھلانے کی نیت پر شکار کیا ہو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ محرم کو ایسے شکار کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں جو اس نے نہ تو خود شکار کیا ہو اور نہ ہی اس کے لیے شکار کیا گیا ہو۔

ہمارا استدلال آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد گرامی ہے۔ (جو طلحہ بن عبیداللہ سے مروی ہے۔ ہم اس محرم کے بارے میں آپس میں جو شکار کا گوشت کھالے گفتگو کر رہے تھے اور آنحضرت ﷺ سوئے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ ہماری آواز سن کر بیدار ہوگئے اور فرمایا کس بارے میں جھگڑ رہے ہو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم محرم کے بارے میں جو شکار کا گوشت کھالے مذاکرہ کر رہے تھے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام مالکؒ نے جو روایت پیش کی ہے اس میں

يُصَادُ لَهٗ میں لام تملیک کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شکار کو پکڑ کر محرم کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ گوشت دینا مراد نہیں (بلکہ محرم خود ذبح کرے اس کی حرمت کے تو ہم بھی قائل ہیں)۔ یا یصاد لہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کہنے پر شکار کیا جائے۔

متن میں امام قدوریؒ نے عدم دلالت کی شرط بھی لگائی ہے۔ یہ شرط اس امر پر نص ہے کہ دلالت بھی حرام ہے۔ (اگر محرم کسی غیر محرم کی شکار کے سلسلے میں راہنمائی کرے اور غیر محرم شکار کرکے ذبح کرے تو اس کا کھانا بھی محرم پر حرام ہوگا)۔ متأخرین فقہاء نے کہا کہ اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں۔ (اگر شکار محرم کی دلالت سے کیا جائے تو امام طحاویؒ نے حرمت کی روایت بیان کی ہے، اور ابی عبیداللہ الجرجانی نے عدم حرمت کی روایت بیان کی ہے)۔ حرمت کی وجہ حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے جو ہم باب الاحرام میں بیان کر چکے ہیں (کہ حضور ﷺ نے شکار کے بارے میں صحابہؓ سے دریافت فرمایا تھا۔ هَلْ اَعَنْتُمْ هَلْ اَشَرْتُمْ، عدم حرمت کا قول ضعیف ہے)۔

مسئلہ : اگر غیر محرم شخص حرم کے شکار کو ذبح کرے تو اس پر قیمت واجب ہوگی جو فقراء پر صدقہ کر دی جائے گی۔ (اگر محرم شکار کرے تو کفارہ

واجب ہوتا ہے) ، کیونکہ حرم کے تقدس کی بناء پر شکار کو امن حاصل ہے اور ایک طویل حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ حرم کے صید کو نہ چھیڑا جائے ۔

اور اسے روزہ رکھنا کفایت نہ کرے گا کیونکہ شکار کی قیمت تو تاوان ہے کفارہ نہیں ہے (کہ روزہ رکھنا بھی مباح ہو) ۔ پس یہ تاوان ضمانت اموال کے مشابہ ہوگا (یعنی اگر کسی کا مال ضائع کیا جائے تو مال کے عوض قیمت دینا پڑتی ہے ، روزے نہیں رکھے جا سکتے) ۔

(مذکورہ دونوں صورتوں میں یعنی محرم صید کو قتل کرے تو روزہ رکھ سکتا ہے ، لیکن غیر محرم اگر ایسا کرے تو قیمت ہی واجب ہوتی ہے) فرق کی وجہ یہ ہے کہ تاوان محل کے وصف کو باطل کرنے کی بناء پر واجب ہوتا ہے ۔ وصف سے مراد امن (اور محل سے مراد صید ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ حرم کے جانور صفت امن سے موصوف ہیں اور جو شخص انہیں اس صفت سے محروم کرتا ہے اس پر تاوان واجب ہو جاتا ہے) ۔ اور جو کفارہ محرم پر واجب ہوتا ہے وہ اس کے فعل کی جزاء ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے شکار کی حرمت ایک خاص علت اور سبب کی بناء پر ہوتی ہے ، اور یہ سبب اس کا احرام ہے ۔ روزہ فعل کی جزاء تو

بن سکتا ہے مگر محل یعنی شکار قیمت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ، (یعنی محرم کے لیے فعل شکار اس کے احرام کی بناء پر منع ہے . لیکن جب اس نے اس فعل کا ارتکاب کیا تو اس پر جزاء بطریق کفارہ واجب ہوگی . اور صوم جزائے فعل بن سکتا ہے مگر غیر محرم کے حق میں فعل شکار کی ممانعت نہیں ہے . لیکن حرم کے جانوروں سے تعرض چونکہ ممنوع ہے لہذا جب حرم کے جانور کا شکار کرے گا تو اس پر شکار کی قیمت واجب ہوگی کیونکہ صوم قیمت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا) .

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ محرم پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لیے بھی روزے کفایت کریں گے . دونوں میں فرق ہم واضح کر چکے ہیں . کیا شکار کے عوض جانور دیا جا سکتا ہے ؟ اس میں دو روایتیں ہیں .

مسئلہ : جو شخص حرم میں شکار کا جانور لے کر داخل ہو اور جانور اس کے ہاتھ میں ہو تو اسے چھوڑ دے . امام شافعیؒ کا اختلاف منقول ہے . (وہ فرماتے ہیں کہ چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں) کیونکہ شرع کا حق بندے کی ملک میں مؤثر نہیں ہوتا . بندے کو ایسی چیزوں کی خود احتیاج ہوتی ہے .

احنافؒ کہتے ہیں کہ جب شکار کا جانور حرم کی حدود میں پہنچ گیا تو حرم کے تقدس کے مد نظر اس سے تعرض جائز نہ ہوگا .

یا تاوان بننے کی بناء پر وہ جانور صید حرم سے ہو جائے گا اور امن کا حق دار ہوگا . جیسا کہ ہم اس سلسلے میں حدیث بیان کر چکے ہیں .

**مسئلہ** : اگر حرم میں پہنچ کر اسے فروخت کردے تو مشتری کے موجود ہونے کی صورت میں سودا منسوخ کر دے . یہ بیع جائز نہیں ہے کیونکہ اس بیع کی بناء پر صید سے تعرض لازم آتا ہے اور یہ حرام ہے .

اور اگر مشتری جا چکا ہو تو اس پر جزاء واجب ہوگی ، کیونکہ جس امن کا وہ جانور استحقاق رکھتا تھا اس نے تعرض کرکے اس امن کو ضائع کر دیا . اگر محرم کسی محرم یا غیر محرم کے ہاتھ شکار کا جانور فروخت کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہوگا ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے (کہ سودا جائز نہ ہوگا) . اور اگر مشتری موجود ہو تو بیع منسوخ ہوگی . اور اگر جانور کو لے کر چلا گیا ہو تو اس پر جزاء واجب ہوگی) .

**مسئلہ** : جو شخص احرام باندھے اور اس کے گھر میں یا اس پنجرے میں جو اس کے ساتھ ہے کوئی پرندہ ہے تو اس کا چھوڑنا ضروری نہیں . امام شافعیؒ (اور امام مالکؒ) فرماتے ہیں کہ اس کا چھوڑ دینا ضروری ہے ، کیونکہ وہ اپنے قبضے میں پرندے کو رکھ کر تعرض کا ارتکاب کر رہا ہے . پس اس کی صورت بھی ہاتھ میں موجود ہونے کی طرح ہوگی .

احنافؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ صحابہؓ احرام باندھا کرتے تھے اور ان کے گھروں میں شکار کے جانور اور پالتو جنگلی جانور ہوتے تھے اور ان کا چھوڑ دینا منقول نہیں ۔ نیز عادت مشہورہ بھی ایسے ہی ہے (کہ گھر میں جو شکار کے جانور ہوں انہیں چھوڑا نہیں جاتا) ، اور اس قسم کا مشہور رواج حجت ہوتا ہے (یعنی زمانۂ رسول اکرم ﷺ سے اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ پالتو شکار کے جانوروں کو چھوڑا نہیں جاتا) ۔ دوسری بات یہ ہے کہ واجب امر تو ترک تعرض ہے اور ان جانوروں سے جوگھر میں محفوظ اورامن‌وامان میں ہیں محرم کی طرف سے قطعاً کوئی تعرض نہیں ہوتا ۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ وہ جانور اس کے ملک میں ہوتا ہے ، (مگر ملک میں ہونے سے تعرض للصید لازم نہیں آتا) کیونکہ اگر وہ اسے جنگل میں چھوڑ بھی دے پھر بھی اس کی ملکیت باقی ہوگی ، لہذا تعرض کے حق میں ملکیت کے باقی رہنے کو کوئی دخل نہیں ۔ (یعنی ملکیت میں تعرض ہونا لازم نہیں آتا ، ورنہ چھوڑ دینے کی صورت میں بھی جزاء واجب ہوتی کیونکہ ملکیۃ تو باقی ہے ۔ ولا قائل بہ)۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جب پنجرہ اس کے ہاتھ میں ہو تو پرندے کا چھوڑنا ضروری ہوگا ، لیکن ایسے طور پر چھوڑے کہ پرندے کے ضائع ہونے کا احتمال نہ ہو ۔

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر غیر محرم کے ہاتھ شکار کا جانور لگ جائے اور بعد میں احرام باندھ لے اور کوئی آدمی اس کے ہاتھ سے شکار کو چھڑا دے ، تو اس آدمی کے ذمے شکار کی قیمت ہوگی . یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے . صاحبینؒ کہتے ہیں کہ وہ قیمت کا ضامن نہ ہوگا ، کیونکہ جانور کو چھڑانے والا تو نیک کام کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا ہے ، اور نیک کام کرنے والوں پر کوئی گرفت نہیں ہوا کرتی . امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو محنت اور کوشش سے پکڑنے کی بناء پر (صید کی) قابل احترام ملکیت حاصل ہو چکی ہے (حتی کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کا جانور ہلاک کردے تو قیمت کا ذمہ دار ہوگا) اور اس کی ملکیت کا احترام احرام باندھ لینے سے باطل نہیں ہو جاتا اور چھڑانے والے نے اس کی مملوکہ چیز کو تلف کر دیا ، لہذا قیمت کا ذمہ دار ہوگا . بخلاف اس کے کہ جب وہ شخص اس جانور کو حالت احرام میں پکڑتا (تو پھر چھڑانے والے پر قیمت کی ذمہ داری نہ ہوتی) کیونکہ اس صورت میں اس کی ملکیت ہی ثابت نہ ہوتی . مذکورہ صورت میں جانور کے مالک پر اتنا ہی واجب تھا کہ تعرض سے باز رہے اور یہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ وہ اسے گھر میں چھوڑ دیتا . لیکن جب چھڑانے والے

نے اس کی مملوکہ چیز کو تلف کرا دیا تو یہ اس کی زیادتی شمار ہوگی ، (لہذا وہ محسن نہ رہا) ۔

آلات لہو و لعب کو توڑنے کی صورت میں بھی یہی اختلاف ہے ۔ (اگر کوئی شخص سازندوں کے آلات توڑ دے تو کیا توڑنے والے پر قیمت واجب ہوگی یا نہ) ؟

مسئلہ : اگر محرم نے شکار کا جانور پکڑا اور کسی دوسرے نے اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا تو بالاتفاق اس پر قیمت نہ ہوگی ۔ محرم کا شکار کے پکڑنے کی وجہ سے حق ملکیت ثابت نہیں ہوا ، کیونکہ شکار محرم کے حق میں محل تملک نہیں رہتا ۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ جب تک تم احرام باندھے ہوئے ہو تم پر خشکی کا شکار حرام ہے ۔ اس کی مثال شراب کی خریداری کی طرح ہوگی ۔ (اگر مسلمان شراب خریدے تو اس پر حق ملکیت ثابت نہیں ہوتا ، اور اگر دوسرا اسے تلف کر دے تو ضمان واجب نہیں ہوتی) ۔

مسئلہ : اگر دوسرا محرم شخص اس پہلے محرم کے ہاتھ ہی میں صید کو مار ڈالے تو دونوں پر جزاء واجب ہوگی ، کیونکہ پکڑنے والا اس جانور کا امن ضائع کرکے تعرض کا ارتکاب کرتا ہے اور قاتل نے تعرض میں مزید پختگی پیدا کردی ۔ (کیونکہ اس نے تو اسے مار ہی ڈالا) ، اور ضمان واجب کرنے کے حق میں

بعد میں پختگی پیدا کرنا بھی ابتدائی عمل اور فعل کے برابر ہے . اس کی مثال وہ گواہ ہیں جو طلاق قبل از دخول پر شہادت دے کر رجوع کرلیتے ہیں . (مثلاً زید نے هنده سے نکاح کیا . ابھی تک اس نے بیوی سے مباشرت نہیں کی . دو گواہوں نے قاضی کے پاس گواہی دی کہ زید نے ہمارے سامنے طلاق دے دی ہے . گواہی کی بناء پر میاں بیوی میں تفریق ہو جائے گی اور زید کو نصف مہر ادا کرنا ہوگا . کچھ عرصے بعد گواہوں نے شہادت سے رجوع کرلیا کہ ہماری گواہی غلط تھی . تو اب گواہوں کے ذمے واجب ہوگا کہ وہ نصف مہر کی رقم زید کو ادا کر دیں کیونکہ ان کی غلط شہادت کی وجہ سے اسے نصف مہر دینا پڑا تھا) .

آخذ یعنی پکڑنے والا رقم کا مطالبہ قاتل سے کرے گا . امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مطالبہ قاتل سے نہیں کیا جائے گا . کیونکہ اس فعل کا اصل ذمہ دار تو پکڑنے والا ہے اور وہ اپنے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈال سکتا .

ہماری دلیل یہ ہے کہ آخذ یعنی پکڑنے والا جانور کے تلف ہونے سے ذرا دیر پہلے تک ضمان کا سبب ہوتا ہے . لیکن قاتل نے جانور کو تلف کرکے آخذ کے فعل کو علت بنا دیا ، تو یہ علة العلة کے استعمال کی صورت ہوگی ، لہذا ضمان اسی (قاتل) کی ذمہ داری ہوگی .

(یعنی آخذ کا فعل ہلاکت جانور سے پہلے پہلے ضمان کا سبب ہوتا ہے کیونکہ جانور کو پکڑا تو اسی نے ہے اور اس کے پکڑنے کے سبب یہ حادثہ پیش آیا . لیکن اگر قاتل اسے قتل نہ کرتا تو ممکن تھا کہ آخذ صید کو زندہ ہی چھوڑ دے اور اپنے ذمہ سے بری ہو جائے . مگر قاتل نے قتل کرکے اب اس کے چھوڑنے کی راہیں مسدود کر دیں . لہذا قاتل نے آخذ کے فعل کو جو ذرا دیر پہلے سبب کا درجہ رکھتا تھا ، علت میں تبدیل کر دیا . اور فعل قاتل علة العلة ہے اور ضمان کی صورت میں مؤاخذہ علة العلة سے ہوتا ہے .

اس کی وضاحت ایک اور مثال سے کی جاتی ہے کہ ایک شخص گھوڑے کا لگام پکڑے تھا . راستے میں گھوڑے نے مثلاً گھی کے برتن کو لات مار دی اور برتن ٹوٹ گیا . اب گھوڑے کا لات مارنا برتن کے ٹوٹنے کی علت ہے . لیکن تاوان گھوڑے پر نہ ہوگا . اصل ذمہ دار تو لگام پکڑنے والا ہے . لہذا وہ علة العلة ہوگا اور ضمان کی ذمہ داری اس پر ہوگی) .

مسئلہ : اگر حرم سے ایسی گھاس یا درخت کاٹا جو کسی انسان کی ملکیت نہیں ہے ، بلکہ خود رو ہے یعنی لوگوں نے اسے نہیں لگایا تو اس پر قیمت واجب ہوگی . البتہ جو خشک ہو جائے (اس کی قیمت واجب نہ ہوگی) کیونکہ اس کی حرمت حرم کے تقدس کے پیش نظر

ثابت ہے ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ نہ تو حرم کی (سبز) گھاس اور نہ ہی اس کے درخت کاٹے جائیں ۔ قیمت کی ادائیگی میں صوم کا کوئی دخل نہ ہوگا ۔ کیونکہ گھاس اور درختوں کے استعمال کی حرمت حرم کی بناء پر ہے نہ کہ احرام کی وجہ سے ۔ تو یہ ضمان محل کے مشابہ ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔ (یعنی صوم افعال کی جزاء تو بن سکتا ہے ، محل کی جزاء نہیں بنتا) ۔

اس کی قیمت فقراء پر صدقہ کر دے ۔ قیمت کی ادائیگی کے بعد اس کا مالک بن جائے گا ، جیسا کہ باقی حقوق العباد میں ہوتا ہے ۔

درخت یا گھاس کاٹنے کے بعد انہیں فروخت کرنا مکروہ ہے ۔ کیونکہ شرعی لحاظ سے ایک ممنوع سبب کی بناء پر اسے ملکیت حاصل ہوئی ہے ۔ اگر فروخت کی عام اجازت دے دی جائے تو لوگوں کے لیے رستہ کھل جائے گا (حتی کہ حدود حرم میں کوئی درخت ہی باقی نہ رہے گا ۔ البتہ کراہت کے ہوتے ہوئے بھی اگر فروخت کر دے تو بیع جائز ہوگی ۔ بخلاف صید کی فروخت کے (شکار کی فروخت کسی صورت میں جائز نہیں) ۔ ان دونوں میں فرق کی وجہ ہم ان شاء اللہ آیندہ اوراق میں ذکر کریں گے ۔

مسئلہ : جو پودے حدود حرم میں (اپنی

مملوکہ اراضی میں) لوگ خود اگاتے ہیں ، جیسا کہ ہر ملک میں (پودے اگانے) کی عادت ہے ، وہ پودے بالاجماع امن کی صفت سے موصوف نہیں ہوتے. (مکہ مکرمہ میں رہنے والے لوگ عہد نبوی سے اب تک اپنے پودے لگاتے ہیں اور کاٹتے رہتے ہیں . اگر ان کے لیے اپنے لگائے ہوئے پودوں کا کاٹنا بھی ممنوع ہو تو گزر اوقات ہی ناممکن ہو جائے) . دوسری بات یہ ہے کہ ان (اشجار وغیرہ) کی حرمت حرم کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر ہے . اور جب ان کا لگانا کسی انسان کی طرف منسوبہ نہ ہو تو ان کی نسبت إلی الحرم کامل طور پر ہوگی (یعنی اگر پودا کسی انسان کے اپنے ہاتھ کا لگایا ہوا نہ ہو . تو پھر یہ حرم کے پودے شمار ہوں گے) .

اور اگر انسان کوئی ایسا درخت لگائے جو عادۃً لگایا نہیں جاتا تو ایسا درخت ان درختوں کے زمرے میں شمار ہوگا جنہیں انسان لگاتے ہیں . (اور اس کے قطع کرنے پر کوئی شے واجب نہ ہوگی) .

اگر مذکور قسم کا درخت (یعنی جسے لوگ عادۃً نہیں لگاتے) کسی انسان کے ملکیت میں خود بخود اگ آئے تو شرع کے حق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، قطع کرنے والے پر ایک قیمت تو حرمت حرم کی خاطر واجب ہوگی ، اور دوسری قیمت کی ادائیگی مالک کو کرنا ہوگی (کیونکہ اس کی ذاتی زمین سے کاٹا گیا . لہذا

مالک بھی قیمت لینے کا حق دار ہوگا) جیسا کہ مملوک شکار کو مارنے کی صورت میں ہوتا ہے. (مثلاً کسی مکی شخص کے پاس پالتو ہرن ہے. کوئی دوسرا اسے مار دے. تو قاتل پر دو ضمان ہوں گے. ایک قیمت حرمت حرم کے عوض اور دوسری مالک کی ملکیت کے بدلے).

حرم کے جو درخت خشک ہو چکے ہیں ان کے کاٹنے کی صورت میں کوئی ضمان نہیں کیونکہ ان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رہی.

**مسئلہ**: حرم میں اگے ہوئے گھاس کو نہ تو چرایا جائے اور نہ کاٹا جائے. البتہ اذخر گھاس کو کاٹنے کی اجازت ہے. (اذخر خوشبودار گھاس کی ایک قسم ہے جو حجاز میں پائی جاتی ہے).

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حرم کی گھاس چرانے میں کوئی ہرج نہیں، کیونکہ اس میں ضرورت اور مجبوری ہے. نیز جانوروں کو روکنا بھی تقریباً ناممکن ہے (کیونکہ جانور تو چلتے چلتے بھی چر لیتے ہیں).

ہماری دلیل وہی مذکورہ روایت ہے (کہ نہ تو حرم کی گھاس اور نہ وہاں کے درخت کاٹے جا سکتے ہیں). اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حدیث سے تو کاٹنے کی ممانعت کا پتا چلتا ہے، چرانے کی ممانعت ثابت نہیں

ہوتی تو صاحب ہدایہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جانور کا دانتوں سے کاٹنا بھی درانتی کے ساتھ کاٹنے کی طرح ہے . رہا مسئلہ ضرورت کا ، تو اس کا حل یہ ہے کہ حدود حرم کے باہر سے گھاس کاٹ کر حرم میں لائی جاسکتی ہے ، (لہذا کوئی ایسی مجبوری باق نہ رہی). بخلاف اذخر کے ، اسے خود رسول اللہ ﷺ نے مستثنی فرمایا ہے ، لہٰذا اس کا کاٹنا اور چرانا دونوں جائز ہوں گے . اسی طرح کھمبی کا استعمال بھی جائز ہوگا (یعنی انہیں حدود حرم سے اکھاڑا جا سکتا ہے کیونکہ وہ جملہ نباتات کے زمرے سے خارج ہیں (وہ صرف برسات کے دنوں میں تھوڑے سے عرصے کے لیے اگتی ہیں) .

مسئلہ : اور جن جنایات کے سلسلے میں ہم نے مفرد کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ اس پر ایک دم واجب ہوگا . اگر قارن اسی فعل کا ارتکاب کرے تو اس پر دو دم واجب ہوں گے ـ ایک دم حج کا اور دوسرا عمرے کا .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قارن پر بھی ایک ہی دم واجب ہوگا ، کیونکہ قارن نے بھی حج و عمرہ دونوں کے لیے ایک ہی احرام باندھا ہوا ہے . مگر ہمارے نزدیک دونوں کا احرام الگ الگ ہوتا ہے . باب القران میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں ہاں اگر قارن

میقات سے عمرے یا حج کا احرام باندھے بغیر گزرے تو اس پر ایک ہی دم واجب ہوگا۔ امام زفرؒ کو اس میں اختلاف ہے (وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ دونوں احرام اس نے مؤخر کر دیے ہیں۔ لہذا ہر احرام کی تأخیر کے بدلے ایک دم ہوگا)۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ میقات سے گزرتے وقت اس کے ذمے ایک احرام باندھنا تھا، لہذا ایک واجب کی تأخیر کی بناء پر ایک ہی جزاء بھی واجب ہوگی۔

**مسئلہ**: جب دو محرم ایک شکار کے قتل میں شریک ہوں، تو ان میں سے ہر ایک پر کامل جزاء واجب ہوگی۔ کیونکہ شرکت کی بناء پر ان میں سے ہر ایک نے پورے طور پر جنایۃ کا ارتکاب کیا ہے، اور یہ جنایۃ دلالت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لہذا جنایۃ کے تعدد کی بناء پر جزاء بھی متعدد ہوگی (یعنی محرم پر جبھ دلالت اور راہنمائی کی بناء پر جزاء لازم ہوتی ہے، تو شرکت سے تو بطریق اولی جزاء واجب ہوگی۔ کیونکہ راہنمائی اور دلالت کا تعلق زبان یا اشارے سے ہوتا ہے۔ اور شرکت میں دونوں بالفعل شریک ہیں)۔

**مسئلہ**: اگر دو غیر محرم حرم کے شکار کے قتل میں شریک ہوں تو ان پر ایک جزاء واجب ہوگی، کیونکہ اس صورت میں جزاء محل یعنی شکار کا بدل ہے۔ جنایۃ کی جزاء نہیں ہے۔ اور چونکہ محل واحد ہے اس لیے

جزاء بھی واحد ہوگی ۔ جیسا کہ اگر دو آدمی مل کر غلطی سے کسی آدمی کو قتل کر دیں تو ان پر ایک ہی دیت واجب ہوگی ۔ (قتل خطاء کی صورت یہ ہے کہ آدمی بندوقیں لےکر شکار کو نکلے ۔ جنگل میں دور سے انہیں کوئی متحرک چیز نظر آئی ۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہرن ہے ۔ دونوں نے ایک ساتھ گولی چلا دی ۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ انسان تھا ، تو اب دونوں پر ایک دیت واجب ہوگی) اور ان دونوں میں سے ہر ایک پر کفارہ ہوگا ۔ (کیونکہ کفارہ فعل کی جزاء ہے اور فعل کے تعدد کی صورت میں جزاء بھی متعدد ہوگی) ۔

مسئلہ : اگر (مرے ہوئے) شکار کو محرم فروخت کر دے یا کسی دوسرے محرم سے خریدے تو بیع باطل ہوگی ۔ جانور اگر زندہ بھی ہوتا تو اس کی بیع باطل تھی ۔ کیونکہ اس کا گوشت استعمال کرنے کے لیے بیع کی جاتی ہے اور وہ امن کی صفت سے محروم ہو جاتا ہے (جو اسے حرم میں ہونے کی بناء پر حاصل ہے ۔ اور حرم کے جانور کو امن سے محروم کرنا ممنوع ہے ، لہذا خرید و فروخت دونوں باطل ہوں گی) ۔ اور جانور کے مارے جانے کے بعد سودا کرنا مردار کی بیع ہوگی (جو جائز نہیں ہے) ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص حرم سے حاملہ ہرنی پکڑ کر لےگیا ۔ ہرنی نے بچے جنے لیکن ماں اور بچے مر گئے ،

تو اس پر ان سب کی جزاء ہوگی . کیونکہ حرم سے نکال لینے کے بعد بھی صید شرعی طور پر امن کا مستحق ہے اور اس کا اپنی اصل جگہ پر واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے . اور یہ واپس کرنا بھی شرعی حق ہے . اور یہ بچوں کے سلسلے میں بھی مؤثر ہوگا (یعنی بچوں کا واپس لوٹانا بھی ضروری ہوتا ہے) .

اگر وہ شخص ہرنی کو حرم سے نکال لانے کے بعد جزاء کی ادائیگی کر دے اور ہرنی بعد میں بچے جنے (اور وہ بچے مر جائیں) تو اس پر بچوں کی جزاء نہ ہوگی . اس کی وجہ یہ ہے کہ جزاء کی ادائیگی کے بعد وہ صفت امن کے حامل نہ رہے . کیونکہ نائب یا بدل کا وصول کرلینا اصل کے وصول کرنے کی طرح ہوتا ہے (یعنی جب قیمت ادا کر دی گئی تو گویا اصل ہرنی ہی ادا کر دی گئی) .

**واللہ اعلم بالصواب**

## بَابٌ مَجَاوَزَة الْوقْت بغَيْر إِحْرَام

# احرام کے بغیر میقات سے گزرنا

مسئلہ : اور جب کوفہ سے آنے والا شخص بستان بنی عامر میں پہنچ کر عمرے کا احرام باندھے لیکن پھر ذات عرق یعنی میقات تک واپس جائے اور تلبیہات کہے تو اس سے دم میقات ساقط ہو جائے گا. (میقات سے احرام کے بغیر گزرنے کی بناء پر دم واجب ہوتا ہے . بستان بنی عامر مکہ کے قریب ایک جگہ ہے جو میقات کی حدود کے اندر ہے اور حرم سے خارج ہے) .

اگر ذات عرق تک واپس جائے لیکن تلبیہ نہ کہے یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہو کر عمرے کا طواف کرلے تو اس پر دم واجب ہوگا . یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے . صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر احرام کی حالت میں میقات تک چلا جائے ، تلبیہ کہے یا نہ کہے، اس پر کچھ واجب نہ ہوگا . امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ تلبیہ کہے یا نہ کہے دم ساقط نہ ہوگا، کیونکہ (میقات سے بغیر احرام کے گزرنے کی) جنایۃ واپس جانے سے

زائل نہیں ہو جاتی اور اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو عرفات سے لوٹ آئے اور پھر غروب کے بعد وہاں واپس چلا جائے.

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس نے مناسب وقت میں متروک امر کا تدارک کرلیا ہے. (مناسب وقت سے مراد یہ ہے) کہ افعال حج کے شروع کرنے سے پہلے پہلے اس نے اصلاح کر لی تھی ، لہذا دم ساقط ہو جائے گا. اور یہ تدارک عرفات سے واپسی کی صورت کے خلاف ہے کیونکہ وہاں متروک امر کا تدارک نہیں ہو سکتا. جیسا کہ ہم باب الجناية میں بیان کر چکے ہیں (کہ غروب شمس تک استدامت وقوف شرط ہے اور مغرب کے بعد لوٹنے سے تدارک فی وقته ممکن نہ رہا) . البتہ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک اگر احرام کی حالت میں لوٹ کر گیا ، تو تدارک مکمل ہوگیا . کیونکہ اس نے میقات کا حق ادا کر دیا . جیسا کہ وہ شخص جو احرام باندھے ہوئے میقات سے خاموش ہو کر گزر جائے (تو تلبیہ نہ کہنے کی وجہ سے اس پر کوئی شے واجب نہیں ہوتی) . اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احرام باندھ کر تلبیہ کہتے ہوئے واپس جانے سے تدارک کی تکمیل ہوتی ہے . کیونکہ احرام کے حق میں خوبی اور عزیمت تو اس امر میں ہے کہ جب اپنے گھر سے روانہ ہو تو

احرام باندھ لے . (مگر لوگوں کی تکالیف کے مد نظر) میقات تک بغیر احرام کے جانے کی اجازت دے دی گئی . لیکن جب میقات پر پہنچے اور احرام باندھے تو نئے سرے سے تلبیہات کہتے ہوئے احرام کی ادائیگی کرے . لہذا تلافیِ مافات کی مناسب صورت یہی ہوگی کہ تلبیہات کہتا ہوا واپس لوٹے . (مذکورہ مسائل اس شخص کے عمرہ کے بارہ میں تھے جو میقات سے احرام کے بغیر گزرے اور پھر احرام باندھ کر واپس جائے . اب حج کے متعلق بتایا جا رہا ہے) کہ اگر کوئی شخص میقات سے احرام کے بغیر گزر جائے ، پھر حج کا احرام باندھ کر واپس میقات تک آئے ، تو اس صورت میں بھی فقہاء کے درمیان عمرے کی طرح اختلاف پایا جاتا ہے .

اگر طواف شروع کرنے اور استلام حجر اسود کے بعد میقات کی طرف لوٹے تو بالاتفاق دم ساقط نہ ہوگا . اور اگر احرام باندھنے سے پہلے ہی میقات پر واپس ہو جائے تو بالاتفاق دم ساقط ہو جائے گا .

یہ تمام مسائل اس صورت میں ہیں جب کوئی شخص حج یا عمرے کا ارادہ رکھتا ہو . ورنہ اگر بستان بنی عامر تک کسی اور کام کے لیے آئے تو وہ مکہ مکرمہ میں بغیر احرام کے داخل ہو سکتا ہے اور اس کا میقات بستان بنی عامر ہی ہوگا . (یہ مکہ مکرمہ میں بغیر احرام کے داخل ہونے کا ایک طریقہ ہے .

وگرنہ کسی آفاق کے لیے میقات سے احرام کے بغیر گزرنا جائز نہیں ہے) . وہ کوفی اور بستان کا باشندہ احرام کے حکم میں مساوی ہوں گے (یعنی جس طرح بستانی مکہ میں احرام کے بغیر آ سکتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی بغیر احرام مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکے گا) ، کیونکہ بستان واجب التعظیم نہیں ہے . لہذا بستان کا ارادہ کرنے سے احرام واجب نہ ہوگا . اور جب بستان میں پہنچ گیا تو اھالیان بستان کے ساتھ لاحق ہوگا اور بستانی اپنی ضرورت کے تحت مکہ مکرمہ میں بغیر احرام کے داخل ہو سکتا ہے اور اسی طرح باہر سے آنے والا شخص بھی . اور امام قدوریؒ کے قول ''ووقته البستان'' سے یہ مراد ہے کہ اس کا میقات حِل کا وہ سارا علاقہ ہے جو بستان اور حرم کے درمیان واقع ہے . اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے . اسی طرح اس شخص کا میقات بھی حل ہوگا جو وہاں داخل ہو کر ان سے ملحق ہوگیا ہے (یعنی باہر سے آنے والا) .

اگر وہ دونوں (بستانی اور باہر سے آنے والا) حل سے احرام باندھیں اور میدان عرفات میں وقوف کرلیں تو ان پر کوئی شے واجب نہ ہوگی . اس سے مراد بستانی اور داخل ہونے والا شخص ہے کیونکہ انھوں نے اپنے میقات سے احرام باندھا ہے .

مسئلہ : اور جو شخص مکہ مکرمہ میں بغیر احرام

کے داخل ہوا پھر اسی سال کے دوران میقات پر گیا اور اس حج کا جو اس کے ذمے تھا اس نے احرام باندھ لیا ، (اور حج کیا) تو یہ حج مکہ مکرمہ میں بغیر احرام داخل ہونے کے قائم مقام بھی ہوگا . (مسئلے کی صورت یہ ہے کہ جب باہر سے کوئی آدمی بغیر احرام مکہ مکرمہ میں داخل ہوتا ہے ، تو اس داخلے کی بناء پر حج یا عمرہ فرض ہو جاتا ہے . اور اگر وہ اسی میقات پر واپس جاکر حج اسلام یا نذر کے حج کا احرام باندھ لیتا ہے ، اور واپس آکر حج کرتا ہے ، تو اسی واجب حج کے ضمن میں وہ حج یا عمرہ بھی ادا ہو جائے گا جو مکہ مکرمہ میں داخلے کی بناء پر فرض ہوا . داخلے کے لیے نیا حج یا عمرہ کرنا ضروری نہیں) .

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ یہ داخلے کے حج کے قائم مقام نہ ہوگا اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس طرح نذر کا حج ، حج اسلام سے ساقط نہیں ہوتا ، یہ بھی ساقط نہ ہو . (مثلاً ایک شخص نے حج کی نذر مانی ، لیکن اس نے حج اسلام کر لیا ، تو حجِ منذور ساقط نہ ہوگا ، بلکہ اس کے ذمے باقی ہوگا . اسی طرح داخلے کا حج بھی ساقط نہ ہوگا) پس اس کی صورت ایسی ہوگئی گویا کہ سال گزر گیا ہے . (اور جب اگلے سال وہ حج اسلام کرے تو بالاتفاق داخلے کا حج ساقط نہ ہوگا) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ شخص مذکور نے اپنے

مناسب وقت میں (یعنی اسی سال کے دوران) متروک کی تلافی کر لی کہ اس پر احرام کے ساتھ اس مقدس مقام کی تعظیم بجا لانا واجب تھا ۔ گویا کہ ابتداء ہی سے حج اسلام کے لیے احرام باندھ کر آیا تھا ۔ (اگر انسان ابتداء ہی حج اسلام کے لیے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں داخل ہو (تو حج اسلام بھی ادا ہو جاتا ہے اور اسی کے ضمن میں داخلے کا حج بھی ادا ہو جاتا ہے) ۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب سال ہی تبدیل ہو جائے تو داخلے کا حج اب اس کے ذمے قرض بن چکا ہے ۔ اور وہ تو اسی احرام سے جو اس کی نیت کرکے باندھا جائے ادا ہوگا ۔ (یعنی اگر وہ سال گزر جائے اور دوسرا سال شروع ہو جائے تو اب حج اسلام کے ضمن میں داخلے کا حج ادا نہ ہوگا ۔ بلکہ آیندہ سال اس کی ادائیگی کی نیت سے احرام باندھنا ہوگا) ۔ جس طرح نذر کے اعتکاف کی صورت میں ہوتا ہے ۔ کیونکہ وہ اسی سال کے روزوں سے ادا ہو سکتا ہے ۔ دوسرے سال کے روزوں سے ادا نہ ہوگا ۔ (مثلاً ایک شخص نے نذر مانی کہ میں ۱۹۷۵ء کے رمضان شریف میں اعتکاف کروں گا اور کسی وجہ سے وہ رمضان شریف کے روزے نہ رکھ سکا تو اب ۱۹۷۶ء کے رمضان شریف کے روزوں میں اس کی ادائیگی نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ اسے مستقل طور پر روزے رکھ کر اعتکاف کرنا ہوگا) ۔

**مسئلہ** : اور جس شخص نے (احرام کے بغیر) میقات سے تجاوز کیا پھر عمرے کا احرام باندھ لیا مگر عمرے کو فاسد کر لیا ، تو وہ عمرے کے افعال کی تکمیل کرے اور آیندہ سال اس کی قضاء کرے . کیونکہ احرام سے وہ چیز (جس کی نیت کرے) لازم ہوجاتی ہے . تو یہ حج کو فاسد کرنے کی طرح ہوگا اور میقات سے بغیر احرام کے گزرنے کی وجہ سے اس پر دم واجب نہ ہوگا . (یعنی جب وہ آیندہ سال عمرے کی قضاء کے لیے آئے گا اور میقات سے احرام باندھ کر گذرے گا اور مکہ مکرمہ میں آ کر عمرہ ادا کرے گا . تو سابقہ فاسد عمرہ کی ادائیگی بھی ہو جائے گی اور میقات سے بغیر احرام کے گزرنے کا کفارہ بھی ادا ہو جائے گا . لہذا اب اس پر دم کے وجوب کا حکم نہ دیں گے . یعنی جب قضاء لازم کر دی گئی تو سزا لازم نہ رہی) . اور امام زفرؒ کے قول پر قیاس کرتے ہوئے تو دم ساقط نہ ہوگا اور اسی اختلاف کی نظیر اس صورت میں بھی پائی جاتی ہے جو بغیر احرام کے میقات سے گزرے اور اس کا حج بھی فوت ہو جائے اور جو بغیر احرام کے میقات سے گزرے . پھر حج کا احرام باندھے لیکن حج فاسد کر دے . (یعنی ایک شخص بغیر احرام کے میقات سے گزرا ، پھر حج کا احرام باندھا ، مگر اسے وقوف عرفہ میسر نہ آ سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا .

اب جب کہ آیندہ حج کے لیے آئے گا احرام باندھ کر میقات سے گزرے گا اور حج کی قضاء کرے گا تو جو نقصان گزشتہ سال میقات سے بغیر احرام گزرنے پر ہوا تھا ، وہ بھی اس حج کی ادائیگی میں پورا ہو جائے گا . لہذا دم واجب نہ ہوگا . مگر امام زفرؒ کے نزدیک دم ساقط نہ ہوگا . اسی طرح ایک شخص بغیر احرام میقات سے گزرا ، پھر حج کا احرام میقات سے باندھا ، مگر وقوف عرفہ سے پہلے جماع کا ارتکاب کر بیٹھا اور حج فاسد ہوگیا ، تو جب آیندہ سال وہ حج کی قضاء کے لیے میقات سے احرام باندھ کر آئے گا اور حج کرے گا تو اس کے سابقہ نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور دم بھی واجب نہ ہوگا ـ خلافاً لزفرؒ) . امام زفرؒ مجاوزت بغیر احرام کو ممنوعات کے زمرے میں شمار کرتے ہیں . (یعنی اگر فائت الحج یا فاسد الحج بغیر احرام کے میقات سے گزرے اور اسی حج میں خوشبو کا استعمال کرے یا حلق کرا لے تو آپ بھی کہتے ہیں کہ اس جنایة کا الگ تاوان دینا ہوگا ، تو پھر مجاوزت بغیر احرام کا تاوان الگ کیوں نہ دے) .

ہم کہتے ہیں کہ جب وہ آیندہ سال قضاء کرے گا تو میقات سے احرام باندھ کر آنے کی صورت میں وہ میقات کا حق بھی ادا کردے گا ، کیونکہ قضاء دراصل فوت شدہ چیز کی حکایت اور نقل ہی تو ہوتی ہے . لیکن

اس قضاء سے دوسرے ممنوعات کا حق پورا نہیں ہوتا (یعنی حج کی قضاء کرنے سے میقات کا حق تو ادا ہو جائے گا ، مگر دوسرے ممنوعات (مثلاً حلق کرانے یا خوشبو لگانے) کا حق اس قضاء سے پورا نہیں ہوتا (لہذا ارتکاب ممنوع میں صدقہ یا دم واجب ہوتا ہے) ۔ پس فرق واضح ہوگیا ۔

مسئلہ : جب مکہ مکرمہ کا باشندہ حل کی طرف حج کا ارادہ کرکے نکلا ، احرام باندھ لیا اور حرم کی طرف لوٹے بغیر عرفات میں وقوف کر لیا تو اس پر بکری واجب ہوگی ، کیونکہ اس کا میقات تو حرم ہے اور اس نے احرام کے بغیر وہاں سے تجاوز کیا ہے ۔

اور اگر وہ حرم میں لوٹ آئے اور تلبیہ کہے یا نہ کہے تو یہ صورت بھی کوفہ سے آنے والے شخص کی صورت کی طرح مختلف فیہ ہے ، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں (کہ امام اعظمؒ کے نزدیک لوٹ کر جانے اور تلبیہ کہنے سے دم ساقط ہو جاتا ہے ۔ صاحبینؒ کے نزدیک لوٹ کر جانے سے ساقط ہوگا اور امام زفرؒ کے نزدیک ساقط نہ ہوگا) ۔

مسئلہ : اور اگر متمتع عمرہ سے فارغ ہو کر حرم سے باہر نکل جائے اور باہر ہی احرام باندھ کر عرفات میں وقوف کے لیے چلا جائے تو اس پر دم واجب ہوگا ۔

کیونکہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرلینے کی بناء پر وہ بمنزلہ مکی کے ہوگا اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مکی کا احرام حرم سے ہوتا ہے ، لهذا حرم سے اس تأخیر کی بناء پر اس پر دم لازم ہوگا .

اور اگر وقوف عرفات سے پہلے حرم کی طرف لوٹ آئے اور حرم سے احرام باندھے تو اس پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا اور مذکورہ بالا صورت میں باہر سے آنے والے کے بارے میں علماء اربعہ میں جو اختلاف بیان کیا گیا ہے وہی اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہے .

واللہ تعالیٰ اعلم

# بَابُ اضافة الإحْرَام

# احرام کو دوسری طرف منسوب کرنے کا بیان

مسئله : امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مکی جب عمرے کا احرام باندھے اور اس کے لیے طواف کا ایک چکر بھی لگا لے ، پھر حج کا احرام باندھ لے تو وہ حج کو ترک کر دے اور اس ترک کی بناء پر اس پر دم واجب ہوگا اور حج اور عمرہ بھی لازم ہوں گے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم ترک عمرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ (حج کے افعال کی تکمیل کرے) اور عمرے کو قضاء کرے۔ عمرے کو چھوڑنے کا دم واجب ہوگا۔

چونکہ مکی کے لیے عمرہ اور حج دونوں کو جمع کرنا غیر مشروع ہے لهذا اسے دونوں میں ایک کو تو چھوڑنا ہی ہے ، تو عمرے کا چھوڑنا اولی ہے کیونکہ عمرہ رتبے میں حج سے فروتر ہے۔ اعمال کے لحاظ سے

کم ہے اور قضا کے لحاظ سے آسان ہے کیونکہ اس کے لیے وقت کی تعیین نہیں ہوتی . (سال کے دوران جب چاہے کر سکتا ہے). اس طرح کا اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہے جب پہلے عمرے کا احرام باندھے پھر حج کا باندھ لے لیکن افعال عمرہ میں سے کسی فعل کی ادائیگی نہ کی ہو . طرفین کے دلائل اوپر درج کر دیے گئے ہیں .

اگر عمرے کے طواف کے چار چکر مکمل کرنے کے بعد حج کا احرام باندھے تو بلا خوف حج کو چھوڑ دے کیونکہ اکثر کل کے حکم میں ہوتا ہے . اب عمرے کا چھوڑنا دشوار ہے . گویا کہ اس سے فراغت حاصل کر چکا ہے . (یعنی جس طرح طواف کی تکمیل کے بعد عمرے کا ترک ممکن نہیں رہتا ، اسی طرح چار چکر لگا لینے کے بعد بھی عمرے کا ترک کرنا ممکن نہ ہوگا) .

اگر عمرے کے طواف کے سلسلے میں چار چکروں سے کم لگائے ہوں ، تو بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہی حکم ہے . (کہ عمرے کی تکمیل کرے اور حج کو ترک کردے) . امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کچھ اعمال کی ادائیگی کی وجہ سے عمرے کے احرام میں تاکید اور پختگی پیدا ہو چکی ہے ، لیکن حج کے احرام میں ابھی تک وہ استواری اور تاکید پیدا نہیں

ہوئی (کیونکہ ابھی تک اس نے حج کا کوئی عمل ادا نہیں کیا) لہذا غیر متأکد امر کو ترک کرنے میں سہولت ہے .

دوسری بات یہ ہے کہ عمرے کے ترک میں ابطال عمل لازم آتا ہے (یعنی جس قدر افعال ادا کر چکا ہے وہ ترک کی صورت میں اکارت جائیں گے) ، اور حج کو ترک کرنے کی صورت میں امتناع یعنی حج سے باز رہنا کسی موجود چیز کو باطل کرنے سے نسبۃً آسان ہوتا ہے) .

البتہ عمرے یا حج میں سے جس کو بھی چھوڑے گا اس پر دم واجب ہوگا ، کیونکہ اوقات مناسبہ سے پہلے ہی اسے متروک کے احرام سے بھی نکلنا ہوگا اور مکی ہونے کی بناء پر وہ دونوں کو جمع تو نہیں کرسکتا (کہ حج اور عمرے دونوں کا احرام باقی رکھے) تو اس کی صورت محصر کی سی ہوگی . (یعنی اگر کسی کو راستے ہی میں حج سے روک دیا جائے حتی کہ حج کا وقت نکل جائے، تو اسے بھی چونکہ وقت سے پہلے احرام کھولنا پڑتا ہے اس لیے اس پر بھی دم واجب ہوتا ہے) .

البتہ یہ بات یاد رہے کہ عمرہ کو ترک کرنے میں صرف عمرہ کی قضاء ہوگی کسی مزید چیز کی نہ ہوگی ، اور حج کو ترک کرنے کی صورت میں حج اور

عمرہ دونوں کی قضاء ہوگی ۔ (یعنی عمرہ چھوڑنے میں صرف عمرہ کی قضاء ہوتی ہے مگر ترک حج سے حج اور عمرہ دونوں کی قضاء ہوتی ہے ۔ مثلا ایک شخص کا حج وقوف عرفات میسر نہ آنے سے فوت ہوگیا تو اس شخص کو احرام سے نکلنے کے لیے عمرہ کرنا پڑے گا اور آیندہ سال حج کی قضاء کرے گا ۔ لیکن حج کو چھوڑنے والا شخص عمرہ اور حج دونوں آیندہ سال کرے گا) ۔

باوجود اس کے اگر مکی (حج اور عمرہ) کے دونوں افعال کی ادائیگی کر دے تو کافی ہوگا ۔ کیونکہ جس طرح اس نے افعال کی ادائیگی اپنے ذمے لی تھی اسی طرح اس سے عہدہ برآ ہوگیا ۔ اگرچہ مکی کے لیے حج اور عمرہ کا جمع کرنا ممنوع ہے لیکن ہمارے اصول کے مطابق نہی تحقیق فعل سے مانع نہیں ہوتی ۔ (احناف کے نزدیک اصول یہ ہے : إن النهی عن الأفعال الشرعیة یقتضی الشرعیة ۔ مثلا چوری کرنا ممنوع ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کی چھری چرا کر بکری ذبح کرے تو بکری حلال ہو جائے گی یا کسی سے کپڑا چھین کر اس میں نماز پڑھ لے تو نماز ادا ہو جائے گی) ۔

اور مذکورہ صورت میں مکی کے ذمے دونوں کو جمع کرنے کی بناء پر دم لازم ہوگا ۔ کیونکہ اس نے (دونوں کو جمع کرکے) ایک ممنوع امر کا ارتکاب کیا

ہے ۔ لہذا اس کے عمل میں نقصان وقوع پذیر ہوا ہے ۔ اور یہ دم مکی کے حق میں دمِ جبر اور آفاق کے حق میں دمِ تشکر ہوگا ۔ (دم جبر یعنی نقصان کو پورا کرنے کے لیے قربانی دینا ۔ اس کا کھانا جائز نہیں ہوتا) ۔

مسئلہ : جس شخص نے حج کا احرام باندھا پھر یوم نحر کو دوسرے حج کا احرام باندھ لیا ، اگر پہلے حج کے سلسلے میں حلق کرا چکا ہو تو دوسرا حج لازم ہوگا اور اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا ۔

اگر پہلے حج کے لیے حلق نہ کرایا ہو تو بھی دوسرا حج لازم ہوگا اور دم بھی واجب ہوگا ، قصر یا حلق کرے یا نہ کرے ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اگر پہلے حج کے سلسلے میں حلق یا قصر نہ کیا ہو تو اس پر کوئی تاوان واجب نہ ہوگا ۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ دو حجوں یا دو عمروں کے احرام کو جمع کرنا بدعت ہے ۔ لیکن جب حلق کرا لے تو یہ حلق اگرچہ پہلے احرام کا نسک ہے لیکن دوسرے احرام کے حق میں جنایۃ ہے کیونکہ دوسرے احرام کے لحاظ سے حلق مناسب اوقات میں نہیں ہے ۔ لہذا بالاجماع اس پر دم واجب ہوگا ۔

اگر (پہلے احرام کے سلسلے میں) حلق نہ کرائے

یہاں تک کہ آیندہ سال حج کرے تو پہلے احرام کے حق میں حلق میں بہت زیادہ تأخیر لازم آئی ہے اور تأخیر کی بناء پر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دم واجب ہوا کرتا ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک کچھ واجب نہیں ہوتا. اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے.

(چونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تأخیر نسک کی بناء پر دم واجب ہوتا ہے) اس لیے امام صاحب نے حلق یا عدم حلق کو مساوی حیثیت دی ہے. مگر صاحبینؒ نے تقصیر یا حلق کو شرط قرار دیا ہے (کہ قصر یا حلق کرے تو دم واجب ہوگا، ورنہ نہیں).

مسئلہ : جو شخص قصر کے علاوہ عمرے کے دیگر افعال سے فارغ ہو جائے اور دوسرے عمرے کا احرام باندھ لے تو اس پر دم واجب ہوگا. کیونکہ یہ دوسرا احرام وقت مناسب سے پہلے ہے. (مناسب وقت قصر کرانے کے بعد احرام باندھنا ہے). نیز دو عمروں کے احرام کو اکھٹا کرنا مکروہ ہے. پس اس پر دم واجب ہوگا. یہ دم جبر و کفارہ ہوگا.

مسئلہ : جو شخص حج کا احرام باندھے پھر (افعال حج کی ادائیگی سے پہلے ہی) عمرے کا احرام باندھ لے تو اس پر عمرہ و حج دونوں لازم ہوں گے. کیونکہ آفاق کے لیے حج و عمرہ کا جمع کرنا مشروع و مباح

ہوتا ہے اور یہ مسئلہ بھی آفاق کے سلسلے میں بیان کیا جا رہا ہے ۔ اس صورت میں وہ قارن بن جائے گا ۔ لیکن اس نے خلاف سنت فعل کا ارتکاب کیا ہے ۔ لہذا گناہگار ہوگا ۔ (امر مسنون یہ ہے کہ عمرے پر حج کو داخل کرے مگر اس نے حج پر عمرے کو داخل کیا ہے) ۔

مسئلہ : اگر مذکورہ صورت میں افعال عمرہ کی ادائیگی سے پہلے عرفات میں وقوف کرے تو وہ عمرے کا تارک شمار ہوگا ۔ بدیں وجہ کہ اس کی ادائیگی متعذر ہے کیونکہ (اگر افعال حج سے فارغ ہو کر عمرہ کرے تو) اس صورت میں عمرہ حج پر مبنی ہوتا ہے اور یہ غیر مشروع ہے ۔ (مشروع صورت یہ ہے کہ حج کو عمرے پر مبنی کیا جائے یعنی پہلے عمرہ کیا جائے پھر حج) ۔ عرفات کی طرف محض روانگی سے ترک عمرہ لازم نہیں آتا جب تک کہ وقوف نہ کرے ۔ (اگر راستے میں لوٹ کر عمرے کے افعال کرلے اور بعد میں وقوف عرفہ کے لیے جائے تو قارن ہوگا) ۔ اس کی تفصیل ہم باب القران میں بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : اگر حج کے لیے طواف (قدوم) کرنے کے بعد عمرے کا احرام باندھ لے تو دونوں لازم ہوں گے اور دونوں کے افعال کی تکمیل کرے ۔ لیکن اس پر دم واجب ہوگا کیونکہ اس نے دونوں کو جمع کیا ہے ۔ اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ آفاق کے لیے

جمع کرنا مشروع ہے، لہذا دونوں کا احرام صحیح ہوگا.

متن میں مذکور طواف سے مراد طواف تحیہ ہے، اور اسے سنت کا درجہ حاصل ہے، رکن نہیں ہے کہ اس کے ترک کر دینے پر کوئی تاوان لازم آئے. چونکہ اس نے ابھی تک (حج کا) کوئی رکن ادا نہیں کیا تو اس کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے عمرے کے افعال کی تکمیل کرلےاور پھر حج کے افعال کی ادائیگی کرے. لہذا دونوں کی تکمیل اس کے لیے جائز ہوگی اور جمع کرنے کی وجہ سے اس پر دم واجب ہوگا اور یہ دم جبر و کفارہ کہلاتا ہے اور یہی صحیح ہے. (بعض حضرات نے اسے دم تشکر کہا ہے) کیونکہ اس نے کسی نہ کسی طور پر افعال عمرہ کو افعال حج پر بناء کیا ہے. (یعنی جمع کرنے میں کسی قدر نقص موجود تھا، لہذا یہ دم، دم جبر و کفارہ ہوگا).

اور مستحب یہ ہے کہ عمرے کو چھوڑ دے کیونکہ حج کے احرام میں طواف قدوم (جیسے فعل) کی بناء پر تأکید کا پہلو نمایاں ہوگیا ہے. ہاں اگر طواف قدوم بھی نہ کیا (تو عمرے کو نہ چھوڑے کیونکہ اب وہ افعال حج کو افعال پر بناء کرنے والا ہوگا اور یہ مشروع ہے).

عمرے کو چھوڑنے پر اس کی قضاء ضروری ہوگی کیونکہ اس کا مشروع کرنا صحیح تھا. (جیسے نفل

شروع کر دینے سے واجب ہو جاتے ہیں : مثلاً چار رکعت نوافل کی نیت کی لیکن ایک رکعت کے بعد چھوڑ دیا تو اب چار رکعات کی قضاء واجب ہوئی) . اور چھوڑ دینے کی وجہ سے اس پر دم واجب ہوگا .

**مسئلہ** : اور جو نحر کے دن یا ایام تشریق میں عمرے کا احرام باندھ لے تو عمرہ اس پر لازم ہو جائے گا جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں (کہ اس کو شروع کرنا صحیح) لیکن (اس کے افعال کی ادائیگی نہ کرے بلکہ) اسے چھوڑ دے اور چھوڑ دینا ضروری ہے . کیونکہ اس نے ابھی ابھی حج کے ارکان سے فراغت حاصل کی ہے . (اگر ساتھ ہی عمرہ شروع کر دے تو) وہ ہر لحاظ سے عمرہ کے افعال کو حج کے افعال پر بناء کرنے والا ہوگا .

نیز ان ایام میں عمرے کی ادائیگی مکروہ بھی ہے (اس کی تفصیل ہم باب الفوات میں درج کریں گے) . پس اس کا چھوڑنا ضروری ہوگا اور چھوڑنے پر دم بھی لازم ہوگا اور قضاء بھی ضروری ہوگی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں .

اگر (چھوڑنے کی بجائے) افعال عمرہ کی تکمیل کرلی تو کافی ہوگا . کیونکہ اس میں کراہت (ذاتی لحاظ سے نہیں بلکہ) لغیرہ ہے . اور وہ اس کا ان دنوں میں حج کے بقیہ اعمال کی ادائیگی میں مشغول ہونا ہے .

لیکن اسے عمرے کی ادائیگی کی عظمت کے مد نظر
کچھ نہ کچھ وقت عمرے کو ادا کرنے کے لیے نکالنا
پڑے گا ۔ (اور افعال حج میں کچھ نہ کچھ بے ترتیبی
لازم آئے گی) اور جمع کی وجہ سے اس پر دم لازم ہوگا ۔
اور یہ جمع یا تو احراموں میں ہے (یعنی اگر حلق سے
پہلے دوسرا احرام باندھ لے تو یہ جمع بین الاحرامین ہے ۔
کیونکہ ابھی پہلے حج کا احرام باقی تھا) یا یہ جمع
باقی ماندہ اعمال میں ہے (یعنی اگر حلق کے بعد عمرے
کا احرام باندھے تو یہ جمع فی الأعمال ہے ۔ کیونکہ ابھی
تک حج کے کچھ افعال مثلاً رمی ، طواف زیارت وغیرہ
باقی ہیں) ۔

مشایخ کہتے ہیں کہ یہ بھی دم کفارہ ہے (دم
شکر نہیں) ۔ مبسوط میں ہے کہ اگر حج کے حلق کے
بعد عمرے کا احرام باندھے تو عمرے کو چھوڑے
نہیں (بلکہ اس کی تکمیل کر لے)۔ بعض حضرات کا قول
ہے کہ چھوڑ دے تاکہ نہی سے احتراز کیا جا سکے
(کیونکہ مذکورہ پانچ ایام میں عمرہ کرنے کی ممانعت
ہے) ۔ فقیہ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشایخ کا
یہی مسلک ہے ۔

**مسئلہ** : اگر اس کا حج فوت ہو جائے پھر عمرے
یا حج کے لیے احرام باندھ لے تو وہ اسے بہر صورت
چھوڑ دے ۔ کیونکہ جس شخص کا حج فوت ہو جائے

اس کے لیے عمرے کی ادائیگی ہی سے احرام کا کھولنا مباح ہوتا ہے (یعنی وہ حج کے احرام سے عمرہ کرکے ہی تحلل حاصل کر سکتا ہے) نہ یہ کہ احرام حج خود بخود احرام عمرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے. اس کی تفصیل إن شاء اللہ باب الفوات میں بیان کی جائے گی. پس وہ شخص افعال کے مد نظر دو عمروں کو جمع کرنے والا ہوگا، لہذا وہ عمرے کو چھوڑ دے. جیسا کہ اگر ابتداءً ہی دو عمروں کے لیے احرام باندھا جائے، (تو ایک عمرے کو چھوڑنا پڑتا ہے).

اگر مذکورہ صورت میں حج کا احرام باندھ لے تو بحیثیت احرام دو حجوں میں جمع کرنے والا ہوگا. لہذا اسے حج کا ترک کرنا بھی ضروری ہے. جیسا کہ اگر ابتداءً ہی دو حجوں کے لیے احرام باندھے (تو ایک کو ترک کرنا پڑتا ہے).

چونکہ اس کا شروع کرنا صحیح تھا لہذا اس پر قضاء واجب ہوگی اور وقت سے پہلے احرام کھولنے کی بناء پر اس پر دم بھی واجب ہوگا.

# بَابُ الْإِحْصَار

# حج سے روکے جانے کا بیان

مسئلہ : جب کوئی محرم دشمن کی وجہ سے (حج یا عمرہ کرنے سے) روک دیا جائے . (جس طرح نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رض کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا تھا)، یا وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے لیے بیت اللہ تک جانا ممکن نہ رہے تو اس کے لیے تحلل یعنی احرام کو کھول دینا جائز ہے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے روک دینے ہی کی صورت میں ہوتا ہے . (مرض کی صورت میں نہیں ہوتا) کیونکہ محصر کو ھدی مکہ مکرمہ بھیج کر احرام کھول دینا اس لحاظ سے مشروع ہے کہ وہ دشمن سے نجات حاصل کر سکے . (جس طرح نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رض نے حاصل کی تھی) . اور احرام کھول کر وہ دشمن سے تو نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن مرض سے نہیں کر سکتا

(لہذا مرض کی بناء پر احصار ثابت کرنا درست نہیں) ۔

احناف کا کہنا ہے کہ آیۃ احصار ، احصار بالمرض کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے ۔ اس پر تمام اہل لغت کا اجماع ہے ۔ اہل لغت کا کہنا ہے کہ احصار مرض کی بناء پر ہوتا ہے اور حصر دشمن کی وجہ سے ۔ نیز محصر ہونے کی صورت میں وقت سے پہلے احرام کھول دینے کی علت یہ ہے کہ امتداد احرام (یعنی اگر احرام کو طویل مدت تک باقی رکھا جائے) سے محرم کو کئی مشکلات اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن مرض کی حالت میں احرام باندھے رکھنے میں مشکلات اور دقتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں (مثلاً کسی وقت مریض کو سر ڈھانپنے کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی مالش کرانا پڑتی ہے) ۔

**مسئلہ** : جب محصر کے لیے تحلل کا جواز ہوگیا تو اسے کہا جائے گا کہ بکری بھیج دے تاکہ حرم میں ذبح کی جائے اور جس کے ہاتھ تو بکری بھیج رہا ہے اسے تاکید کر دے کہ بکری کو مقررہ دن میں ذبح کیا جائے ۔ (ان امور کی تکمیل کے بعد) اب تو احرام کھول سکتا ہے ۔ حرم میں بھیجنے کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ دم احصار عبادت کا درجہ رکھتا ہے ۔ لیکن خون بہانا کسی خاص وقت یا کسی خاص مقام میں قربت بن سکتا ہے ۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ۔

لہذا حرم کے علاوہ کسی اور مقام پر ذبح کرنا قربت نہیں بن سکتا اور نہ اس سے احرام کھولا جاسکتا ہے .

(دم احصار کے قربت ہونے کا) اس آیت میں اشارہ موجود ہے : **وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ** یعنی تم اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے. کیونکہ لفظ ھدی اس جانور کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے حرم کی طرف لے جایا جا رہا ہو .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ذبح کے لیے حرم کی تخصیص کرنا درست نہیں کیونکہ ھدی رخصت اور رعایت کی بناء پر مشروع ہے اور تخصیص کر دینے سے تخفیف اور رعایت باطل ہو جاتی ہے .

اس کے جواب میں احناف کہتے ہیں کہ رعایت اور رخصت سے جنس تخفیف مراد ہے . (کہ ھدی بھیج دے اور جب وہ قربان گاہ پر پہنچ جائے تو احرام کھول دے) .

تخفیف کی نہایت ملحوظ نہیں (کہ ھدی ارسال کرتے ہی احرام کھول دے . بلکہ اگر ھدی کے وہاں پہنچنے تک دو تین دن احرام کی حالت میں گزر بھی جائیں تو اس سے جنس تخفیف کا بطلان لازم نہیں آتا اور جب جنس تخفیف سے کام چل سکتا ہے تو نہایت تخفیف کی طرف

رجوع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دم روانہ کرتے ہی احرام کھول دے . نیز ارشاد الٰہی میں بھی حتی یبلغ الھدی محلہ ہے) .

اور بکری بھی ھدی کے طور پر جائز ہے کیونکہ نص میں لفظ ھدی کا ادنی درجہ بکری ہے . نیز گائے اور اونٹ کا ساتواں حصہ بھی جائز ہے جس طرح قربانی میں ہوتا ہے . اور متن میں لفظ شاۃ سے مراد یہ ہے کہ بہر صورت بکری ہی بھیجی جائے . کیونکہ بعض دفعہ بکری ارسال کرنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے (یعنی بکری میسر نہیں آ سکتی) تو اس صورت میں بکری کی قیمت بھیج سکتا ہے کہ وہیں سے بکری خرید کر اس کی طرف سے ذبح کر دی جائے .

امام قدوریؒ کے قول ''ثُمَّ تَحَلَّلْ'' میں اس امر کا اشارہ ہے کہ اس پر حلق یا قصر واجب نہیں ہے . امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں . (اگر حرم میں احصار ہو تو حلق یا قصر واجب ہوتا ہے . اگر غیر حرم میں احصار ہو تو واجب نہیں اور حضور ﷺ نے بھی حدیبیہ کے اس رقبے میں حلق کرایا تھا جو حرم کی حدود میں شامل ہے) .

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حلق یا قصر مستحب ہے اور اگر نہ کرے تو اس پر کچھ واجب

نہ ہوگا. کیونکہ حضور ﷺ نے حدیبیہ والے سال حلق کرایا تھا اور صحابہ کرامؓ کو بھی ایسا کرنے کا ارشاد فرمایا تھا.

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حلق اس وقت قربت اور عبادت کا درجہ حاصل کرتا ہے جب افعال حج پر مرتب ہو. افعال حج سے پہلے نسک نہ ہوگا. حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اس لیے حلق کرایا تھا تاکہ دشمن پر واضح ہو جائے کہ ہم واپس جانے کا پختہ عزم کر چکے ہیں. (یعنی دشمن کا شبہ دور کرنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا کہ دشمن کو علم ہو جائے کہ ہم عمرے کا ارادہ نہیں رکھتے، بلکہ واپس جا رہے ہیں).

مسئلہ : اگر محصر قارن ہو تو دو دم بھیجے کیونکہ اسے دو احراموں سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے. اور اگر وہ صرف ایک ہی ھدی بھیج دے کہ اس سے حج کے احرام سے نکل جاؤں گا اور عمرے کا احرام باقی رہے گا تو کسی ایک احرام سے بھی تحلل حاصل نہ ہوگا. کیونکہ ان سے تحلل حالت واحدہ ہی میں مشروع ہے. (الگ الگ نہیں ہو سکتا. مثلاً حج کا احرام آج کھولے اور عمرے کا کچھ مدت بعد).

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دم احصار کا

ذبح کرنا حرم کے سوا جائز نہیں ہے البتہ یوم نحر سے پہلے ذبح کیا جا سکتا ہے .

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ محصر بالحج کے لیے یوم النحر کے سوا ذبح کرنا جائز نہیں اور محصر بالعمرہ کے لیے کسی وقت کی تخصیص نہیں جب چاہے ہو جائے. صاحبینؒ حج کے احصار کے دم کو ھدی تمتع اور قران پر قیاس کرتے ہیں . (قران اور تمتع کے دم وقت اور مقام دونوں کے ساتھ مخصوص ہیں . اسی طرح دم احصار بھی ہوگا) . نیز صاحبینؒ اسے حلق پر بھی قیاس فرماتے ہیں کیونکہ ان میں ہر ایک محلل ہے . (یعنی جس طرح حلق محلل ہے اور یوم نحر کے ساتھ خاص ہے . اس طرح ذبح محصر بھی محلل ہے تو یوم نحر کے ساتھ خاص ہوگا) . امام ابو حنیفہؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ دم کفارہ ہے . حتی کہ اس سے کھانا جائز نہیں ہوتا . تو دوسرے کفارات کے دم کی طرح یہ دم بھی مکان سے خاص ہوگا ، زمان سے خاص نہ ہوگا .

دم تمتع اور دم قران پر قیاس کرنا درست نہیں . کیونکہ وہ دم نسک ہیں (دم کفارہ نہیں) . نیز حلق پر بھی قیاس کرنا درست نہیں ہے . چونکہ حج کے معظم اور اہم فعل یعنی وقوف کی تکمیل ہوچکی ہے ، اور حلق وقوف کے بعد ہوتا ہے . لہذا حلق اپنے مناسب وقت میں پایا گیا (مگر ذبح محصر اپنے مناسب وقت میں نہیں

پایا جاتا کیونکہ محصر کی صورت میں حج کا کوئی فعل ادا نہیں کیا جاتا . لہذا تخصیص بالزمان درست نہیں) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ محصر بالحج جب احرام کھول دے تو اس پر حج اور عمرہ واجب ہوں گے . حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے اسی طرح مروی ہے . حج کی قضاء تو اس لیے واجب ہے کہ اس نے حج کو شروع کر کے چھوڑ دیا ہے اور عمرہ کی قضاء اس بناء پر ہوگی کہ وہ ایک لحاظ سے فائت الحج ہے . (اور فائت الحج عمرہ کی ادائیگی کی بناء پر احرام کھولتا ہے) .

**مسئلہ** : محصر بالعمرۃ پر عمرے کی قضاء ہوتی ہے . ہمارے نزدیک عمرے سے بھی احصار ہو سکتا ہے . امام مالکؒ احصار بالعمرۃ کے تحقق کے قائل نہیں . ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ حدیبیہ کے مقام پر روک دیے گئے تھے اور وہ عمرے کے احرام باندھے ہوئے تھے . دوسری بات یہ ہے کہ ھدی بھیج کر احرام کا کھولنا ازالۂ حرج کے لیے ہوتا ہے اور یہ حرج اور دقت تو عمرے کے احرام میں بھی پائی جاتی ہے . جب احصار کا تحقق ہوگیا تو قضاء واجب ہوگی یعنی جب محصر احرام کھول دے گا تو اس پر عمرے کی قضاء واجب ہوگی جیسے حج میں ہوتا ہے .

مسئلہ : قارن پر حج اور دو عمروں کی قضاء ہوگی .
حج اور ایک عمرے کی وجہ تو بیان کی جا چکی ہے اور دوسرے عمرے کی قضاء اس بناء پر ہے کہ اس نے عمرے کو شروع کرکے بوجہ احصار ناتمام چھوڑا ہے .

مسئلہ : اگر قارن ھدی بھیج دے اور لے جانے والوں کو تأکید کر دے کہ اسے فلاں معین دن ذبح کر دیا جائے . لیکن اس کا احصار جاتا رہے اور وقت اس قدر قلیل ہو کہ وہ نہ تو حج کو پا سکتا ہے نہ ھدی تک پہنچ سکتا ہے ، تو اس کے لیے مکہ مکرمہ جانا ضروری نہیں . بلکہ وہیں ٹھیرا رہے . حتی کہ ھدی کے ذبح ہونے پر احرام کھول دے کیونکہ اس کے جانے سے اصل مقصد یعنی افعال حج کا ادا کرنا تو حاصل ہونے سے رہا . اگر اس مقصد کے تحت چلا جائے کہ عمرہ کرکے احرام کھول دے گا ، تو ایسا کر سکتا ہے کیونکہ وہ فائت الحج ہے (اور عمرہ کرنا اس کے ذمے ہے) .

اگر وقت اتنا ہو کہ وہ حج کو پا سکتا ہو اور ھدی تک پہنچ سکتا ہو تو اس کا جانا ضروری ہوگا . کیونکہ خلف یعنی بدل سے مقصد حاصل کرنے سے پہلے پہلے اس کی مجبوری کا ازالہ ہوگیا ہے .

جب ھدی کو پالے تو اس کے بارے میں جو چاہے (یعنی فروخت کر دے یا صدقہ کر دے) کر سکتا

ہے ، کیونکہ ھدی اس کی ملکیت میں ہے اور جس مقصد کے لیے اسے بھیجا گیا تھا ، اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی ۔

اگر حج کا وقت نکل چکا ہو اور ھدی تک پہنچ سکتا ہو ، تو وہیں احرام کھول دے کیونکہ اصل مقصد کی تکمیل ممکن نہ رہی ۔ اگر حج کو پا سکتا ہو لیکن ھدی تک نہ پہنچ سکتا ہو تو استحسان کے مدنظر اس کے لیے تحلل جائز ہوگا ۔

یہ صورت صاحبین کے قول کے مطابق محصر بالحج کے بارے میں درست نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک دمِ احصار یوم نحر سے مخصوص ہوتا ہے ۔ اور جو شخص حج کو پا لے گا وہ یقیناً ھدی کو بھی پا لے گا (کیونکہ حج عرفہ کے دن ہوتا ہے ۔ اور ھدی کے ذبح کے لیے یوم النحر ہے) ۔

یہ صورت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق درست ہے (کیونکہ وہ یوم النحر کی تخصیص کے قائل نہیں) ۔

محصر بالعمرہ کی صورت سب حضرات کے نزدیک درست ہے کیونکہ عمرے کے دم کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں ہوتا ۔

قیاس کی وجہ یہ ہے ، اور یہی امام زفر کا قول

بھی ہے کہ اسے بدل یعنی مقصود ھدی حاصل ہونے سے پہلے اصل یعنی حج پر قدرت حاصل ہو گئی . (یعنی ھدی کی وجہ سے تحلل سے پہلے پہلے وہ حج کر سکتا ہے ، لہذا اس کے لیے حج پر جانا ضروری ہے ، ھدی بھیج کر احرام نہیں کھول سکتا) .

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم اس کے لیے مکہ مکرمہ جانا لازم قرار دیں ، تو اس کے مال کا ضیاع ہے . کیونکہ پہلے ھدی تو ایک شخص کے ہاتھ بھیج چکا ہے .تاکہ اس کی طرف سے ذبح کر دی جائے . اب اگر اس کا جانا بھی ضروری قرار دیں تو مال بھی ضائع ہوا اور اس کو مقصد یعنی تحلل بھی حاصل نہ ہو سکا (کیونکہ جب مکہ مکرمہ کی طرف روانگی ضروری ہوئی تو وہ احرام نہ کھول سکے گا . اب بتائیے کہ ھدی کے بھیجنے کا کیا فائدہ ہوا ؟) اور شریعة کے نزدیک مال کی بھی وہی حرمت ہے . لہذا اس کے مال کے بچاؤ کے مدنظر مکہ مکرمہ جانا ضروری نہ ہوگا) اور اس کو اختیار ہے کہ یا تو وہیں ٹھہرا رہے ، یا کسی اور جگہ چلا جائے ، تاکہ ھدی کے ذبح کا وقت آ جائے اور وہ احرام کھول سکے . اگر چاہے تو مکہ مکرمہ روانہ ہو جائے اور اس حج کی — جسے وہ احرام باندھ کر اپنے ذمے لازم کر چکا ہے— ادائیگی سے عہدا برا ہو جائے . اور مکہ مکرمہ چلے

جانا ہی بہتر ہے ، کیونکہ اس سے "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اُرِیْدُ الْحَجَّ" والا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا .

مسئلہ : جس شخص کو وقوف عرفہ کے بعد روک دیا گیا وہ محصر شمار نہ ہوگا ، کیونکہ اب حج کے فوت ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا . البتہ طواف زیارت باقی رہ گیا ، وہ جب چاہے کر لے . ہاں اگر ایام تشریق کے بعد طواف زیارت کا موقع ملے تو تاخیر کی بناء پر دم بھی واجب ہوگا . اور جس شخص کو مکہ مکرمہ میں روک دیا جائے کہ نہ تو طواف کر سکے اور نہ وقوف کر سکے ـ تو وہ محصر شمار ہوگا ، کیونکہ اس کے لیے حج کے افعال کی تکمیل متعذر ہے . پس یہ اس شخص کی مانند ہوگا جس کو حرم کی حدود سے باہر حلّ میں روک دیا جائے .

اگر کسی ایک (طواف یا وقوف) پر اسے قدرت حاصل ہو جائے تو محصر نہ رہے گا . طواف پر قدرت کی صورت میں (اس لیے محصر نہ ہوگا) کہ اسے طواف کرنے سے تحلل حاصل ہو جائے گا ، جس طرح فائت الحج کو حاصل ہوتا ہے . اور دم طواف کا بدل ہوتا ہے . (یعنی جب محصر نے طواف اور سعی کر لی تو احرام کھول سکتا ہے . کیونکہ دم طواف ہی کا بدل ہے) . (جب اصل پر قدرت ہے تو بدل کی کیا

ضرورت ؟ فائت الحج سے تشبیہ دینے کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح فائت الحج کو عمرے کے لیے طواف وسعی کرکے احرام کھولنا ہوتا ہے ، اسی طرح یہ شخص طواف وسعی کے بعد احرام کھول سکتا ہے) .

اور اگر وقوف میسر آئے تو اس کی صورت ہم ابھی بیان کر چکے ہیں (کہ جسے عرفہ میں وقوف میسر آ جائے وہ محصر نہیں ہوتا) .

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں (کہ کوئی شخص مکہ میں محصور ہو اور طواف ووقوف پر قادر نہ ہو) امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے درمیان اختلاف ہے . لیکن جو تفصیل میں نے بیان کی ہے وہی صحیح ہے (کہ انہیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے) .

(علی بن جعد کا کہنا ہے میں نے ابو حنیفہؒ سے پوچھا : آپ کا اس محرم کے بارے میں کیا خیال ہے ، جسے حدود حرم میں محصور کر لیا گیا ہو؟ فرمایا کہ وہ محصر نہیں ہوتا . میں نے عرض کیا : کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ کے اس حصے میں محصور نہیں کیا گیا تھا جو حرم کی حدود میں شامل ہے ؟ اور احصار کو درست قرار دیا گیا تھا . امام ابو حنیفہؒ نے جواب میں فرمایا : ان دنوں مکہ مکرمہ دارالحرب تھا اور آجکل دار الاسلام ہے .

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں : اگر خدا نخواستہ کہیں دشمن مکہ مکرمہ پر غالب ہو جائیں اور بیت اللہ اور اس کے درمیان حائل ہو جائیں ، تو وہ محصر شمار ہوگا .

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ دونوں حضرات میں کوئی خاص اختلاف نہیں . اور اس بارے صحیح بات وہی ہے جس کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں) .

## بَابُ الْفَوَاتِ

# حج کے فوت ہونے کا بیان

مسئلہ : جس شخص نے حج کا احرام باندھا لیکن اسے وقوف عرفہ میسر نہ آ سکا ، حتی کہ یوم النحر کی فجر طلوع ہو گئی ، تو اس کا حج جاتا رہا . ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وقوف کا وقت یوم نحر کی فجر کے طلوع سے اختتام پذیر ہو جاتا ہے .

اسے چاہیے کہ طواف اور سعی کرے اور حلق کرکے احرام کھول دے ، آئندہ سال حج کی قضاء کرے اور اس پر دم لازم نہ ہوگا .

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جسے رات کے وقت بھی وقوفِ عرفہ میسر نہ آ سکا اس کا حج جاتا رہا ، پس وہ عمرہ کرکے احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرے . (ملاحظہ کیجیے اس حدیث میں دم کا کوئی ذکر نہیں) اور عمرہ ، طواف وسعی کا نام ہے . دوسری بات یہ ہے کہ جب احرام کا باندھنا صحیح ہو جاتا ہے تو پھر احرام سے نکلنے کا

ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ حج و عمرہ میں سے ایک کی ادائیگی کر لے۔ (لیکن اب جبکہ حج کی ادائیگی ممکن نہیں عمرہ ہی باقی رہ گیا ہے) جیسا کہ احرامِ مبہم کی صورت میں ہوتا ہے۔ (ایک شخص نے میقات پر احرام باندھا لیکن حج یا عمرے میں سے کسی چیز کی نیت نہ کی تو اس کے لیے ضروری ہے کہ طواف شروع کرنے سے پہلے پہلے ایک نسک کی نیت کرے۔ اسی طرح شخص مذکور کے لیے بھی عمرے کی ادائیگی ضروری ہوگی) اور حج کے فوت ہو جانے کی صورت میں اس کی ادائیگی تو ممکن نہیں لہذا عمرہ خود بخود متعین ہو جائے گا؛ اور اس پر دم نہ ہوگا۔ (امام شافعیؒ اور امام مالکؒ وجوبِ دم کے قائل ہیں) کیونکہ افعالِ عمرہ کی ادائیگی سے اسے تحلل حاصل ہو جائے گا۔ تو یہ عمرہ فائت الحج کے حق میں اس دم کے قائم مقام ہوگا جو محصر کو عمرہ سے محروم رہ کر دینا پڑتا ہے۔ پس دونوں کو (یعنی عمرہ اور دم کو) جمع نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ** : عمرہ فوت نہیں ہوتا۔ کیونکہ پانچ ایام کے علاوہ پورے سال میں کسی وقت بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جن پانچ دنوں میں اس کی ادائیگی مکروہ ہے، وہ دن یہ ہیں: یوم عرفہ، یوم نحر اور تشریق کے تین دن۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ سے مروی ہے کہ

وہ ان پانچ ایام میں عمرہ کرنے کو مکروہ جانتی تھیں ، کیونکہ یہ ایام تو حج کے لیے ہیں لہذا اسی کے افعال کی ادائیگی کے لیے متعین ہوں گے .

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں ، کہ یوم عرفہ کو زوال سے پہلے عمرہ کرنے میں کوئی کراہت نہیں ، کیونکہ رکن حج یعنی وقوف کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے پہلے نہیں ہوتا .

لیکن اس سلسلے میں مناسب بات وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں (کہ ان پانچ ایام میں عمرہ کرنے سے احتراز کرے) . اگر باوجود کراہت کے ان ایام میں سے کسی دن عمرہ کر لیا تو صحیح ہوگا . لیکن اس عمرے کے باوجود محرم ہی رہے گا ، کیونکہ ان ایام میں (عمرے کی کراہت) ذاتی نہیں ہے ، بلکہ دوسرے امر کی بناء پر ہے کہ امور حج کی اہمیة کو مد نظر رکھے . اور وقت کو خالصةً امور حج کے لیے ہی صرف کرے . لہذا جب عمرے کو شروع کر ہی دیا تو صحیح ہوگا .

**مسئلہ:** عمرہ سنت ہے . امام شافعیؒ (اور امام احمدؒ) فرضیة کے قائل ہیں . حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ عمرہ فریضہٌ حج کی طرح فرض ہے .

ہماری دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ حج فرض ہے اور عمرہ نفل ہے .

دوسری بات یہ ہے۔ کہ عمرہ کسی خاص وقت سے مخصوص نہیں۔ نیز نیت غیر سے بھی ادا ہو سکتا ہے جیسا کہ فائت الحج کی صورت میں۔ (یعنی اگر احرام حج کی نیت سے باندھے تو بھی اس احرام سے عمرہ ادا ہو سکتا ہے۔ فائت الحج کی صورت میں احرام تو حج کی نیت کرکے باندھا جاتا ہے، مگر اس سے عمرہ ادا ہو جاتا ہے)۔ یہ تمام امور عمرے کے نفل ہونے کی علامات ہیں۔ امام شافعیؒ کی پیش کردہ حدیث کی تأویل یہ ہے کہ حج کی طرح عمرے کے اعمال بھی مقدر اور مقرر ہیں۔ (اگر اس تأویل کو تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی فرضیت ثابت نہیں ہوتی) کیونکہ جب روایات میں تعارض ہو تو فرضیۃ ثابت نہیں ہوا کرتی۔

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں : عمرہ طواف اور سعی کرنے سے مکمل ہو جاتا ہے۔ باب التمتع میں اس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔

وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

## بَابُ الحَجِّ عَنِ الغَيْرِ

# کسی دوسرے سے حج کرانے کا بیان

مسئلہ : حج عن الغیر کے سلسلے میں یہ اصول کار فرما ہے کہ أهل السنة والجماعة کے مسلک کے مطابق اس امر کا جواز ہے ، کہ انسان اپنے نیک اعمال مثلاً نماز ، روزے اور صدقے وغیرہ کا اجر وثواب کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے (یہاں أهل السنة والجماعة کا لفظ معتزلہ کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے ، کیونکہ وہ انتقال ثواب کے قائل نہیں ہیں) . نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ملیح رنگ کے (یعنی خوش منظر) دو دنبے قربانی میں دیے ایک اپنی ذات اقدس کی طرف سے اور دوسرا اپنی امت کے ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے اللہ تعالی کی وحدانیة اور آپ کی رسالت کا اقرار کیا ہے .

آنحضرت نے ایک بکری اپنی امت کی طرف سے قربان کی . (اس سے ایصال ثواب کا ثبوت ملتا ہے) .

عبادات کی کئی اقسام ہیں . ۱- مالی عبادت جیسے زکاۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ ، ۲- بدنی عبادت جیسے نماز . ۳- مالی اور بدنی دونوں سے مرکب عبادت جیسے حج .

پہلی نوع کی عبادات میں اختیار و اضطرار دونوں حالتوں میں نیابت جائز ہے ، کیونکہ نائب مقرر کرنے سے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے (مثلاً ایک شخص اپنے دوست سے کہتا ہے کہ مجھے زکاۃ کے سلسلے میں بیس روپے ادا کرنا ہیں تم میری طرف سے ادا کر دو ، پھر میں تمھیں دے دوں گا) .

نوع ثانی کی عبادات میں کسی صورت میں بھی نیابت جائز نہیں ، کیونکہ بدنی عبادات کا مقصد یہ ہے کہ اپنے نفس کو مشقت میں ڈال کر اللہ تعالی کی رضا حاصل کی جائے . اور یہ اتعابِ نفس نیابت کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا .

نوع ثالث کی عبادات میں دوسرے معنے کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے عاجز ہونے کی صورت میں نیابت جائز ہے . معنی ثانی سے مراد اتعاب نفس ہے . اور مال کا خرچ کرنا بھی مشقت نفس ہی ہے . اگر انسان کو خود حج کا سفر کرنے پر قدرت حاصل ہو تو پھر نیابت جائز نہ ہوگی ، کیونکہ اس صورت میں مشقت نفس والا پہلو معدوم ہوتا ہے (یعنی جب وہ خود جانے

پر قادر ہے تو نائب کیوں مقرر کرتا ہے ؟ کیا سفر کی تکلیفات سے پہلو تہی کرتا ہے ؟ ہاں عاجز ہونے کی صورت میں تو نیابت کا جواز ہو سکتا ہے) ۔

عجز سے مراد وقتی عجز نہیں ، بلکہ موت کے وقت تک عجز دائم مراد ہے ۔ کیونکہ حج تمام عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے (ممکن ہے موت سے قبل اس کی صحت اچھی ہو جائے تو اس صورت میں اس پر فرضیۃ حج باق ہوگی ۔ لہذا عجز سے مراد دائمی عجز ہے جو موت تک باق رہتا ہے) ۔

نفلی حج میں قدرت ہوتے ہوئے بھی نیابت ممکن ہے ، کیونکہ نوافل میں بڑی وسعتیں اور رعایتیں ہیں ۔ پھر ظاہر مذہب کے مطابق حج اس شخص کی طرف سے ادا ہوگا جس کی طرف سے کیا جا رہا ہے ۔ اس مسئلے کے بہت سے شواہد احادیث نبویہ میں موجود ہیں ۔ اور حدیث خثعمیہ تو اس سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے سوال کے جواب میں فرمایا : اپنے باپ کی طرف سے حج کرو اور عمرہ بھی ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ حج کرنے والے کی طرف سے حج ہوگا اور اسے بھیجنے والے کو اخراجات کا ثواب ملے گا ، کیونکہ حج بدنی عبادت ہے اور عجز کی صورت میں انفاق کو حج کے قائم مقام قرار دیا جائے

گا ، جیسا کہ روزے کے باب میں فدیہ (فدیہ صوم نہیں بنتا ، بلکہ روزے کے قائم مقام ہوتا ہے . اسی طرح اخراجات حج نہ بنیں گے بلکہ حج کے قائم مقام ہوں گے) .

**مسئلہ** : امام قدوری فرماتے ہیں کہ ایک شخص کو دو آدمیوں نے حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے حج کرے . اس شخص نے دونوں کی طرف سے حج کا احرام باندھ لیا تو یہ حج صرف حج کرنے والے کی طرف سے ہوگا اور اخراجات کا ذمہ دار ہوگا .

(کیونکہ اصول تو یہ ہے) کہ حج حکم دینے والے کی طرف سے ہو ، حتی کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی طرف سے حج کر لے تو اس پر اپنا فریضہ حج باقی رہتا ہے (یعنی اگر کوئی صاحب استطاعت کسی کی طرف سے حج کر آئے تو اپنا فریضہ اس پر باقی ہوگا . اور اس پر حج کرنا واجب ہوگا) لیکن مذکورہ صورت میں اسے دونوں میں سے ہر ایک شخص نے یہی حکم دیا کہ وہ بلا اشتراک غیر (فقط) میرے لیے حج کر آئے چونکہ حکم دینے والوں کی پوزیشن مساوی ہے لہذا وہ حج کو کسی ایک کے لیے خاص نہیں کر سکتا . (کیونکہ ایک کو اولیت دینے کی کوئی دلیل موجود نہیں . لہذا یہ حج مأمور کی اپنی طرف سے ہوگا . (سوال مان لیا کہ حج مأمور کی طرف

سے ہوگا۔ لیکن حج کرنے کے بعد تو وہ کسی ایک
کی طرف منسوب کر سکتا ہے ، کہ یہ حج جو میری
طرف سے ہوا ہے میں اسے فلاں کے لیے مخصوص کرتا
ہوں . صاحب ہدایہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے
ہیں کہ) اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ حج کرنے
کے بعد کسی ایک کے لیے مخصوص کر دے (جب
دونوں کی حیثیت مساوی ہے تو ایک کو اولیت کیوں
دی جائے) . بخلاف اس صورت کے کہ جب اپنے والدین
کی طرف سے حج کرے تو اس کے لیے جائز ہے کہ
والدین میں سے کسی ایک کے لیے مخصوص کر دے .
کیونکہ وہ اپنے صالح عمل کا اجر و ثواب کسی ایک
کے لیے یا دونوں کے لیے مخصوص کرکے نیکی کر رہا
ہے . لہذا حج سے فارغ ہونے کے بعد بھی اسے اختیار
ہے کہ جس کے لیے چاہے ثواب کی تخصیص کرے .
(اس کی وجہ یہ ہے کہ وارث غیر مأمور ہوتا ہے .
اولا جو کسی دوسرے کے لیے اس کے حکم کے بغیر
حج کرے تو وہ دوسرے کی طرف سے حج کرنے والا
نہیں ہوتا ؛ بلکہ اپنے عمل صالح کا ثواب اسے دینے
والا ہوتا ہے) . لیکن مذکورہ صورت میں وہ حکم آمر
کی وجہ سے حج کر رہا ہے لیکن اس نے ان کے حکم
کی مخالفت کی ہے ، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا حکم
یہ تھا کہ خالصۃً میرے لیے حج کرے . اور یہ ممکن

نہ رہا)، کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخصیص ممکن نہیں، لہذا یہ حج مامور کی طرف سے ہوگا)۔

اگر اس نے ان کے مال سے خرچ کیا ہے تو ادائیگی کا ضامن ہوگا۔ کیونکہ اس نے آمر کی رقم کو اپنے حج پر صرف کیا ہے۔ اگر احرام مبہم طور پر باندھا، یعنی معین کیے بغیر ایک کے حج کے لیے نیت کر لی، حتی کہ افعال حج کی تکمیل کر لی، تو اس صورت میں بھی وہ ان کے حکم کی مخالفت کرنے والا ہوگا۔ کیونکہ کسی ایک کو اولیت نہیں دے سکتا۔ (اس صورت میں بھی حج مامور کی طرف سے ہوگا)۔

اگر حج کے افعال شروع کرنے سے پہلے ایک معین آمر کی نیت کر لے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہی صورت ہے (یعنی احرام باندھتے وقت کسی کو معین نہ کیا، مگر افعال حج کی ابتداء کرنے سے پہلے ایک کی تعین کر دی۔ طرفینؒ کے نزدیک یہ حج اس معین آمر کی طرف سے ہو جائے گا۔ مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کی اپنی طرف سے ہوگا، کیونکہ اسے ہر ایک نے یقین کرنے کا حکم دیا تھا لیکن احرام کے وقت اس نے تعیین نہ کی بلکہ ابہام کیا۔ اور ابہام تعیین کی ضد ہے۔ چنانچہ اس نے آمرین کے حکم کی مخالفت کا ارتکاب کیا۔ لہذا یہ حج مامور کی طرف سے ہوگا)۔

اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے (کہ مأمور کی طرف سے ہو) کیونکہ اسے تو تعیین کرنے کا حکم دیا گیا تھا . اور ابہام تعیین کی ضد ہے . لہذا حج اس کی اپنی طرف سے ہوگا . (سوال : ایک شخص نے احرام باندھا اور حج یا عمرے کسی کی نیت بھی نہ کی . لیکن افعال کے شروع کرنے سے پہلے وہ تعیین کر سکتا ہے ، تو مذکورہ صورت میں کیوں تعیین نہیں کر سکتا ؟ صاحب ھدایہ اس کے جواب میں کہتے ہیں) بخلاف اس صورت کے کہ جب احرام باندھتے وقت حج یا عمرے کی تعیین نہ کرے . لیکن ابتداء افعال سے پہلے وہ جس طرح چاہے تعیین کر سکتا ہے ، کیونکہ جو چیز اس نے اپنے اوپر لازم کی ہے وہ مجہول ہے . (کیونکہ حج یا عمرہ میں سے اس نے کوئی چیز معین نہیں کی) اور مذکورہ صورت **مَنْ لَهُ الحقّ** (یعنی حقدار) مجہول ہے . (لہذا آپ کا قیاس درست نہ رہا . اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے . ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے زید کے کچھ روپے دینے ہیں . اب چونکہ **مَنْ لَهُ الحقّ** معلوم ہے . اقرار صحیح ہوگا . اور اگر کہے کہ مجھے کسی کے دس روپے دینے ہیں تو اقرار صحیح نہ ہوگا ، کیونکہ من لہ الحق مجہول ہے) .

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق

استحسان کی وجہ یہ ہے ، کہ احرام اس بناء پر مشروع ہے کہ وہ افعال کی ادائیگی کے لیے وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے ۔ احرام بنفسہ مقصود نہیں ہوتا ۔ اس لیے مبہم احرام بھی تعیین کے واسطے سے وسیلہ بن سکتا ہے (یعنی جب تعیین کر دی جائے تو اس کا وسیلہ بننا درست ہو جاتا ہے) ۔ اور صحت افعال کے لیے اس شرط کا ہونا کافی ہے ۔ (یعنی احرام افعال حج کے لیے شرط ہوتا ہے اور مبہم شے بھی شرط بن سکتی ہے ۔ یعنی جب اداء افعال سے پہلے تعیین کر لی گئی تو احرام کا ابہام جاتا رہا ۔ تو اب صورت یوں ہوگی کہ گویا اس اس نے احرام باندھتے وقت ہی ایک آمر کو معین کر دیا تھا ۔ اور حج اس آمر کی طرف سے ہوگا) ۔ لیکن جب ابہام کی صورت میں افعال کی ادائیگی کر لے تو بعد میں تعیین ممکن نہیں ہوتی کیونکہ جو افعال ادا کیے جا چکے ہیں وہ اب متعین نہیں کیے جا سکتے ۔ لہذا وہ آمرین کی مخالفت کرنے والا شمار ہوگا ۔

مسئلہ : امام محمدؒ فرماتے ہیں : اگر کوئی شخص دوسرے کو حکم دے کہ میری طرف سے قران کرو ، تو دم احرام باندھنے والے پر ہوگا کیونکہ یہ دم تشکر ہے ۔ کہ اللہ تعالی نے اسے جمع بین النسکین کی توفیق عطا کی ہے ۔ اور اس نعمت سے مأمور ہی مستفیض ہوا ہے ۔ کیونکہ افعال کا صدور اسی سے ہوا ہے ۔

اور اس مسئلہ سے کہ دم ِقران مأمور پر واجب ہے امام محمدؒ سے مروی روایت کی صحت کی شہادت ملتی ہے کہ حج مأمور کی طرف سے ہوتا ہے . (اور آمر کو ثواب ملتا ہے . حج مأمور کی طرف اس بناء پر ہے کہ دم ِقران وہ اپنی طرف سے دے رہا ہے) .

**مسئلہ :** اور مسئلے کی یہیٖ صورت ہوگی جب اسے ایک شخص اپنی طرف سے حج کرنے کو کہے ، اور دوسرا اسے عمرہ کرنے کو کہے ، اور وہ دونوں کی ادائیگی قران کی صورت میں کرے تو قران کا دم اس پر واجب ہوگا جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے .

**مسئلہ :** امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک احصار کا دم آمر پر واجب ہوتا ہے . امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ دم احصار مأمور پر ہوگا کیونکہ دم احصار اس لیے واجب کیا جاتا ہے کہ محرم کو امتداد ِ احرام کی بناء پر تکالیف کا سامنا نہ ہو . اور ان تکالیف کا تعلق چونکہ مأمور کے ساتھ ہے لہذا دم بھی اسی پر واجب ہوگا .

طرفینؒ کا کہنا ہے کہ یہ ذمہ داری اس پر آمر ہی نے ڈالی ہے لہذا اس کی رہائی کا بندوبست بھی اسی کے ذمے ہوگا .

اگر وہ شخص کسی فوت شدہ شخص کی طرف سے

حج کر رہا ہے تو طرفینؒ کے نزدیک دم مال میت سے ادا کیا جائے گا. لیکن امام ابو یوسفؒ کو اس میں بھی اختلاف ہے. بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ دم کی قیمت میت کے مال کی تہائی سے ادا کی جائے گی. کیونکہ یہ زکاۃ وغیرہ کی طرح صلہ ہے. (صلہ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر عرض مالی کے مال دینا). (اگر مالِ میت کی تہائی دم کی قیمت سے کم ہو تو وارثوں کی مرضی ہوگی، کہ باقی مال سے دم کی قیمت پوری کریں یا نہ کریں). دیگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ سارے مال سے دم کی قیمت ادا کی جائے گی، کیونکہ دم کی قیمت مأمور کی طرف سے آمر پر حق بن چکی ہے، اور یہ اس کے ذمے قرض ہوگی. (لہذا اگر تہائی سے دم کی قیمت پوری نہ ہو تو باقی مال سے پوری کی جائے گی).

**مسئلہ** : اور جماع کا دم حج کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ یہ جنایۃ کا دم ہے، اور اپنے اختیار سے جنایۃ کا ارتکاب کرنے والا وہی ہے. علاوہ ازیں اخراجات کا ضامن بھی (وہی) ہوگا. اس کا مطلب یہ ہے، کہ وقوف سے پہلے جماع کرنے کی صورت میں اس کا حج فاسد ہو جائے گا. (اور اس فساد کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہوگی، لہذا دم جنایۃ بھی دے گا اور اخراجات بھی واپس کرے گا) کیونکہ اسے تو صحیح و سالم

حج کرنے کا حکم دیا گیا تھا ۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب کسی وجہ سے اس کا حج فوت ہو جائے تو وہ اخراجات کا ذمہ دار نہ ہوگا ، کیونکہ حج کا فوت ہو جانا اس کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا ۔

اگر وقوف عرفہ کے بعد جماع کرے تو اس کا حج فاسد نہ ہوگا ، اور اخراجات لوٹانے کا ضامن بھی نہ ہوگا ، کیونکہ آمر کا مقصد حاصل ہو چکا ہے ۔ البتہ مأمور پر اس کے اپنے مال سے دم ہوگا جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں (کہ یہ دم جنایۃ ہے) اسی طرح کفارات کے تمام دم بھی مامور کے ذمے ہوں گے ۔ (کیونکہ یہ دم جنایات ہوں گے) ۔

**مسئلہ :** امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے مرتے وقت اپنے وارثوں کو وصیت کی کہ اس کی طرف سے حج کیا جائے ۔ وارثوں نے ایک شخص کو میت کی طرف سے حج کرنے کے لیے مقرر کیا ۔ لیکن جب وہ کوفہ پہنچا تو فوت ہو گیا ، یا اس کی رقم چرا لی گئی حالانکہ وہ نصف خرچ کر چکا تھا ، تو میت کے باقی مال کے تہائی حصے کی رقم سے پھر گھر سے کسی شخص کو حج کے لیے روانہ کیا جائے گا ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے ۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ جہاں پہلا مأمور فوت ہوا ہے وہاں سے اس کی طرف سے حج کرایا جائے گا ۔

اس مسئلے میں دو صورتیں زیر بحث آئیں گی :
ثلث کا اعتبار کرنا اور مکان حج ۔

متن میں مذکور مسئلے کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے ۔

اس مسئلے میں فقہاء ثلاثۃ کے الگ الگ اصول ہیں ۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب مامور راستے میں مر جائے اور جو رقم اس کے پاس رہ جائے اس کو باقی مال میں جمع کر کے ثلث نکالیں گے ، اگر اس ثلث سے حج کے اخراجات پورے ہو سکیں تو حج کرایا جائے گا ورنہ نہیں ۔ اگر مامور کا سارا مال راستے میں چوری ہو جائے تو باقی کے ثلث سے حج کرایا جائے گا ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ پہلے تہائی حصے سے اگر کچھ بچ جائے تو حج کرائیں گے ورنہ نہیں ، یعنی جب مامور راستے میں مر جائے اور جو رقم اس کے پاس بچ جائے اسے پہلے ثلث میں جمع کریں گے ۔ اگر یہ رقم حج کے لیے کافی ہو تو حج کرایا جائے گا ۔ اگر اخراجات پورے نہ ہوں تو حج نہیں کرایا جائے گا ۔ اگر مامور کی ساری رقم چوری ہو جائے تو دیکھیں گے کہ اگر ثلث اول سے باقی ماندہ رقم حج کے لیے کافی ہو تو حج کرایا جائے گا ورنہ نہیں ۔

امام محمدؒ کا قول ہے کہ جو مامور کو حج کے اخراجات کے سلسلے میں پہلے دیا گیا تھا، اس کی موت کی صورت میں جو باقی بچا ہے، اگر اس سے حج کے اخراجات پورے ہو سکتے ہوں تو حج کرایا جائے گا ورنہ وصیت باطل ہو گی، اور مال کے چوری ہو جانے کی صورت میں بھی وصیت باطل ہوگی).

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ اگر مامور کو دیے گئے مال میں سے کچھ باقی بچ گیا ہے اور اس سے حج بھی ہو سکتا ہے تو حج کرایا جائے گا. ورنہ وصیت باطل ہوگی. ہم اس صورت کو موصی کی معین کردہ رقم پر قیاس کریں گے (یعنی اگر موصی خود کچھ رقم حج کے لیے مقرر کر جائے اور مامور کے راستے میں وفات پا جانے کی صورت میں اتنی رقم باقی ہو جس سے حج کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں تو وصیت باطل ہو جاتی ہے - یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا. امام محمدؒ پر سوال کیا گیا کہ موصی نے تو کوئی رقم متعین نہیں کی. امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وصی کی تعیین موصی کی تعیین کے قائم مقام ہوگی. (یعنی جو معین رقم وصی مامور کو دے رہا ہے گویا کہ اسے موصی ہی متعین کر کے گیا تھا).

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ثلث اول کی باقی ماندہ رقم سے اگر حج ہو سکتا ہے تو حج کرایا جائے

گا (ورنہ نہیں) ، کیونکہ وصیت کا نفاذ تہائی مال تک ہی ہوتا ہے .

امام ابو حنیفہؒ اپنے مسلک کی تائید میں فرماتے ہیں:

[اس دلیل کو سمجھنے کے لیے چند باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے . حقوق العباد دو قسم کے ہوتے ہیں .

۱ ۔ وہ مال جس کا کوئی خصم یا مدمقابل موجود ہو جو اس پر قابض ہو سکے . اس صورت میں وارثوں کی ادائیگی سے میت کا حق ادا ہو جاتا ہے . مثلا ایک شخص مر گیا اور اس کے ذمے زید کا ایک ہزار روپیہ قرض ہے ، تو قرض خواہ مال کا خصم اور مدمقابل موجود ہے . اور قرض کی ادائیگی ہو جانے پر اس کا قبضہ بھی مسلم ہو جائے گا . اس لیے وارثوں کا حق ہے کہ وہ میت کے مال سے قرض ادا کریں تا کہ میت کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ رہے اور مذکورہ صورت میں قرض کی ادائیگی سے میت کا حق ادا ہو جائے گا .

۲ ۔ میت کے مال کا کوئی ایسا خصم موجود نہ ہو جو قبضہ کرنے کا حق رکھتا ہو . تو اس صورت میں جب تک میت کی وصیت مکمل نہ کی جائے اس کا حق ادا نہیں ہوتا . مثلاً ایک شخص مر گیا اور وصیت کر گیا کہ میری طرف سے حج کرا دیا جائے . اب اس

صورت میں مال میت کا مد مقابل کوئی نہیں. یعنی کوئی
شخص وارثوں سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ میت کی
طرف سے مجھے ہی حج پر روانہ کیا جائے:

ورثاء نے ایک شخص کو رقم دے کر میت کی
طرف سے حج کرنے کے لیے بھیج دیا۔ راستے میں اس کا
مال چوری ہو گیا. تو باقی مال کے ثلث سے پھر حج
کے اخراجات دیے جائیں گے. ورنہ موصی کی وصیت
پوری نہیں ہوتی اور نہ اس کا حق ادا ہوتا ہے،
کیونکہ میت تو وصیت کر گئی تھی کہ میری طرف
سے حج کرایا جائے۔ لہذا وصیت کے ایفاء کے لیے
دوبارہ ثلث دیا جائے گا. اور یوں فرض کیا جائے گا
کہ گویا پہلے کوئی ثلث لیا ہی نہیں گیا]. (اب امام
صاحب کے استدلال کو لیجیے فرماتے ہیں کہ) وصی
کا موصی کے مال سے وصیت کا حصہ نکالنا اور الگ کرنا
اس وقت تک صحیح نہ ہوگا جب تک کہ موصی کی
وصیت کے مطابق اسے دوسرے کے حوالے نہ کیا جائے
(تاکہ وہ اس کی طرف سے حج کر آئے اور جب تک
حج کی تکمیل نہ ہوگی اس وقت تک تکمیل کرنے والے
کی وصیت کا حق ادا نہ ہو گا)، کیونکہ اس مال کا کوئی
مد مقابل نہیں ہے جو قبضہ کر سکے. (اور مأمور کے
مر جانے یا مال کے چوری ہو جانے کی صورت میں) مال
وصیت کے مطابق دوسرے کے حوالے کرنا صحیح نہ

ہوگا (لہذا دوسری مرتبہ پھر پورے مال کا ثلث نکال کر حج کے اخراجات پورے کیے جائیں گے)، جیسا کہ مأمور اگر ثلث مال کی تقسیم اور علیحدگی سے پہلے ہی فوت ہو جائے (تو دوسرے مأمور کا تقرر ضروری ہوتا ہے)، پس باقی مال کے ثلث سے حج کرایا جائے گا.

اب دوسری صورت کو لیجیے کہ مکان الحج میں کیا اختلاف ہے.

امام ابو حنیفہ[ؒ] کا قول ہے، اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ جس قدر سفر طے کیا جا چکا ہے دنیوی احکام کے پیش نظر وہ باطل ہوچکا ہے (لہذا دوسرے مأمور کو پھر میت کے گھر سے اخراجات دے کر روانہ کرنا ہوگا). حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، ہاں تین قسم کے عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں - إلیٰآخر الحدیث. اور وصیت کا نفاذ بھی دنیوی احکام کے زمرے میں آتا ہے - لہذا وصیت کے پیش نظر سفر کی ابتداء وطن ہی سے ہوگی، گویا کہ پہلا سفر وجود میں آیا ہی نہیں تھا.

صاحبین[ؒ] کے قول کی وجہ یہ ہے، اور استحسان کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ طے شدہ سفر کو باطل قرار نہ دیا جائے. اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے

گھر سے اللہ تعالی اور اس کے رسول کی خاطر ھجرۃ کرتے ہوئے نکلتا ہے۔ پھر اسے موت آ لیتی ہے تو اس کا اجر اللہ تعالی کے ذمے ہے۔ نیز حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو شخص حج کرتے ہوئے راستے میں فوت ہو جاتا ہے ہر سال اس کے اعمال میں ایک حج مبرور لکھ دیا جاتا ہے۔ (حج مبرور وہ حج ہے جو جنایات وغیرہ سے پاک ہو)۔ جب سابقہ سفر باطل نہ ہوا تو وصیت کا اعتبار اسی مقام سے کیا جائے گا۔

یہ مذکورہ اختلاف در اصل اس صورت میں تھا کہ جب انسان خود حج کے لیے روانہ ہو، راستے میں مر جائے اور وصیت کر جائے کہ میری طرف سے حج کرا دینا۔ اسی صورت میں مأمور بالحج کے مسائل کو مبنی کیا گیا ہے (یعنی جب مأمور راستے میں مر جائے)۔

مسئلہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں جس شخص نے اپنے والدین کی طرف سے حج کا احرام باندھا اس کے لیے جائز ہے کہ اس حج کو والدین میں سے کسی ایک کے لیے مخصوص کر دے۔ (مطلب یہ ہے کہ والدین میں سے کسی ایک کو اس حج کا ثواب دے سکتا ہے)، کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کی طرف سے اس کی اجازت کے بغیر حج کرتا ہے وہ اپنے حج کا ثواب اسے دے سکتا ہے۔ اور ایسا کرنا حج کی ادائیگی کے

بعد ہی ممکن ہے۔ اگر حج کی ادائیگی سے پہلے کسی ایک کو ثواب دینے کی نیت کرے تو ایسی نیت لغو ہو جائے گی۔ (کیونکہ جس فعل کا ثواب دوسرے کو دینا ہے۔ اس فعل کا مکمل ہونا تو ضروری ہے)۔ حج کی ادائیگی کے بعد اس کا ثواب والدین میں سے کسی ایک کو دینا صحیح ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب مأمور کو دو آدمیوں کی طرف سے حج کرنے کا حکم ہو۔ اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

# بَابُ الْهَدْی

# هدی کا بیان

**مسئلہ :** هدی کے لیے ادنی جانور بکری ہے۔ حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ سے هدی کے بارے میں سوال کیا گیا ، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ هدی کا کم سے کم جانور بکری ہے۔

**مسئلہ :** هدی کی تین اقسام ہیں: اونٹ ، گائے اور بکری۔ چونکہ حضور ﷺ نے بکری کو هدی کا ادنی درجہ قرار دیا ہے تو یقیناً اس کا اعلی درجہ بھی ہوگا اور وہ گائے اور اونٹ ہے۔ چونکہ هدی سے مراد وہ جانور ہے جسے تقرب حاصل کرنے کی غرض سے حرم کی طرف لے جایا جاتا ہے اور اس حیثیت سے تینوں اصناف یکساں ہیں۔

**مسئلہ :** جو جانور قربانی کے لیے دیے جا سکتے ہیں وہ هدایا میں بھی دیے جاسکتے ہیں، کیونکہ قربانی کی طرح اس قربت کا تعلق بھی اراقۃ الدم یعنی خون بہانے سے ہے۔ لہذا یہ نوعیت وخصوصیت کے لحاظ سے بھی یکساں

ہوں گے . (یعنی بکری ایک سال کی ، گائے دو سال کی اور اونٹ پانچ سال کا ہو) .

**مسئلہ** : دو مواضع کے علاوہ بکری کو بطور ہدیہ دینا ہر جگہ جائز ہے ، وہ دو مواقع یہ ہیں : اول یہ کہ طواف زیارت جنابۃ کی حالت میں کیا جائے. دوم یہ کہ وقوف عرفہ کے بعد جماع کا ارتکاب کیا جائے . ان دونوں صورتوں میں بدنہ واجب ہوگا . باب الجنایات میں اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے .

**مسئلہ** : تطوع ، تمتع اور قران کے هدی سے کھانا جائز ہے. کیونکہ یہ دم نسک ہے اور قربانی کے گوشت کی طرح هدی کا گوشت کھانا بھی جائز ہے . یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے هدی کا گوشت تناول فرمایا اور شوربہ بھی پیا .

**مسئلہ** : مذکورہ روایت کی بناء پر مستحب یہ ہے کہ اپنے هدی کے گوشت سے کچھ کھایا جائے . نیز یہ امر بھی مستحب ہے کہ قربانی کے گوشت کی تقسیم کی طرح هدی کے گوشت کی تقسیم بھی کی جائے اور اسی طرح صدقہ کیا جائے .

باقی هدایا سے کھانا روا نہیں . (بلکہ سارا گوشت فقراء و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے) . اور یہ کفارات

کے دم ہوتے ہیں ، اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حدیبیہ میں محصور ہوگئے تھے تو آپ ﷺ نے ناجیۃ الاسلمی کے ہاتھ ھدایا کو حرم میں بھیج دیا اور فرمایا کہ تم اور تمھارے رفقاء ان میں سے کچھ نہ کھائیں .

**مسئلہ** : تطوع ، تمتع اور قران کے ھدایا کو یوم نحر کے علاوہ ذبح کرنا جائز نہیں ہے . مصنفؒ فرماتے ہیں : مبسوط میں مذکور ہے کہ دم تطوع کو یوم نحر سے پہلے ذبح کیا جا سکتا ہے . البتہ نحر کے دن ذبح کرنے میں فضیلت ہے .

مبسوط کی بات صحیح ہے کیونکہ تطوّعات میں قربت کی حیثیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ ھدایا ہیں اور یہ بات حرم میں پہنچ جانے سے پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے . (لیکن وقت کی کوئی شرط نہ ہوگی) . جانور جب حرم میں پہنچ جائے تو یوم نحر کے علاوہ بھی ذبح کیا جا سکتا ہے . البتہ ایام نحر میں ذبح کو فوقیت حاصل ہوگی . کیونکہ خون بہانے میں جو قربت ہوتی ہے وہ ان دنوں میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے (لوگ ہر طرف جانور قربان کرتے دکھائی دیتے ہیں) .

لیکن تمتع اور قِران کا دم یوم نحر سے مخصوص ہوتا ہے . اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا**

اَلْبَائِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لِيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ ، یعنی خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاجوں کو بھی دیں پھر اپنا میل کچیل دور کر دیں .

ظاہر ہے کہ قضاء تفث یوم نحر سے مخصوص ہے اور چونکہ مذکورہ دم دمِ نُسک ہیں . پس قربانیوں کی طرح یوم نحر سے مخصوص ہوں گے .

باقی ھدایا کو اپنی منشاء کے مطابق ذبح کیا جا سکتا ہے . (دم کفارہ ، دم نذر اور دم احصار وغیرہ کو جب چاہے حرم میں ذبح کر دے) .

امام شافعیؒ انہیں بھی دم متعہ اور قران پر قیاس فرماتے ہوئے یوم نحر کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں . کیونکہ ان کے نزدیک دونوں یعنی دم قران اور تمتع دم جبر ہیں (جو نقصان کی تلافی کے طور پر دیے جاتے ہیں . تو جب باقی دم جبر اور دم کفارات یوم نحر کے ساتھ خاص ہیں تو یہ دم بھی یوم نحر کے ساتھ خاص ہوں گے . (امام شافعیؒ کے نزدیک افراد افضل ہے . قران اور تمتع میں حج اور عمرے کا اکھٹا کرنا ان کے نزدیک نقص ہے اور اسی نقص کی تلافی کے لیے دم واجب کیا جاتا ہے ، لہذا دم جبر ہوگا) .

احناف کہتے ہیں کہ یہ کفارات کے دم ہیں لہذا یوم نحر سے خاص نہ ہوں گے ، کیونکہ ان کا

وجوب نقصان کی تلافی کرنے کے مد نظر ہے، اور جبر نقصان میں تعجیل زیادہ مناسب ہے تاکہ کسی تاخیر کے بغیر نقصان کا ازالہ کر دیا جائے. مگر دم متعہ اور قران کی صورت ان سے مختلف ہے کیونکہ وہ دم نسک ہیں .

مسئلہ : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ حرم کے علاوہ کہیں ھدایا کا ذبح کرنا جائز نہیں ہے . جزاء صید کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے . هَدْياً بٰلِغَ الْكَعْبَةِ. پس یہ آیت ہر دم کفارہ کے لیے اصل (اور مقیس علیہ) ہوگی . (اور تمام کفارات کو جزاء صید پر قیاس کیا جائے گا). دوسری بات یہ ہے کہ ھدی اس جانور کو کہتے ہیں جسے کسی مکان کی طرف لے جایا جائے اور ھدی کا مکان حرم ہے . نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ منی سارے کا سارا ذبح کرنے کی جگہ ہے اور (مکہ کی طرف سے) اس کا راستہ بھی ذبح کرنے کی جگہ ہے .

مسئلہ : مساکین حرم اور دوسروں پر ھدایا کے گوشت کا صدقہ کرنا جائز ہے . امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے (وہ فرماتے ہیں کہ صرف فقراء حرم ہی پر صدقہ کیا جائے) . ہم کہتے ہیں کہ صدقہ معقول قربت ہے . نیز ہر فقیر پر صدقہ معقول قربت ہے، (لہذا فقراء حرم کی تخصیص درست نہیں) .

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ ھدایا کی "تعریف" کی کوئی ضرورت نہیں . (تعریف سے مراد یہ ہے کہ انہیں عرفہ میں لے جاکر ذبح کیا جائے یا قلادہ ڈالا جائے) کیونکہ ھدی کے لفظ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اسے کسی مکان کی طرف لے جایا جائے تاکہ وہاں خون بہا کر تقرب حاصل کیا جا سکے . لیکن اس لفظ سے تعریف کا کوئی پتا نہیں چلتا ، لہذا تعریف واجب نہ ہوگی .

البتہ تمتع کے دم کی تعریف کرنا مستحسن ہے ، کیونکہ دمِ تمتع یوم نحر کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور ممکن ہے اسے کوئی ایسا انسان میسر نہ آسکے جو اس کی حفاظت کرے ، اس لیے اسے اپنے ساتھ لے کر عرفات میں جانا ہوگا . دوسری بات یہ ہے کہ دم تمتع دم نسک ہوتا ہے اور دم نسک میں تشہیر مناسب ہوتی ہے . (لہذا اسے قلادہ ڈالا جا سکتا ہے اور عرفات میں ساتھ لے جایا جا سکتا ہے) .

مگر کفارات کے دم کی صورت اس سے مختلف ہے ، کیونکہ انہیں یوم نحر سے پہلے بھی ذبح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں . دوسری بات یہ ہے کہ دم کفارہ کا سبب جنایۃ ہوتی ہے اور جنایات میں پردہ پوشی ہی مناسب امر ہے .

**مسئلہ** : اونٹ کو نحر کرنا اور گائے اور بکری

کو ذبح کرنا افضل ہے . (ذبح گردن کی اوپر کی طرف سے یعنی جو حصہ سر سے قریب ہوتا ہے اور نحر گردن کی نچلی طرف سے ہوتا ہے ، یعنی جو حصہ ہنسلی کی ہڈی کی طرف ہوتا ہے) . اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ** ، یعنی اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور نحر کیجیے . وانحر کی تأویل نحر جزور سے کی گئی ہے . یعنی اونٹوں کو قربانی کے طور پر نحر کیجیے اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے : **اَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً** کہ گائے ذبح کریں . نیز ارشاد باری ہے : **وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ** یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک بڑی قربانی فدیے میں دی . ذِبح سے مراد وہ ہے جو ذَبح کے لیے تیار کیا جائے . نیز یہ امر بھی ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اونٹ کو نحر کیا اور گائے اور بکری کو ذبح کیا .

ھدایا کے اونٹوں کو کھڑا کرکے نحر کرے یا لٹا کر . جو صورت بھی اختیار کرے درست ہے . افضل یہ ہے کہ انھیں قیام کی حالت میں نحر کرے . صحیحین میں مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ھدایا کو کھڑا ہونے کی حالت میں نحر کیا اور صحابہ کرام رض بھی اونٹ کی اگلی دائیں ٹانگ (دوہری کرکے) باندھ دیتے تھے اور اونٹ کو کھڑا کرکے نحر کرتے تھے .

بکری اور گائے کو کھڑا کر کے ذبح نہ

کیا جائے، کیونکہ اگر انھیں لٹا دیا جائے تو ذبح کرنے کی جگہ نمایاں طور پر سامنے ہوتی ہے اور ذبح کرنا آسان ہوتا ہے. (گائے اور بکری کو ذبح کرنا ہی مسنون ہے).

**مسئلہ** : اگر انسان خود اچھی طرح ذبح کر سکتا ہو، تو اپنے ہدی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اولی ہے. روایت کی گئی ہے کہ حضور ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر سوار اونٹ لے کر گئے تھے اور آپ ﷺ نے ساٹھ اور چند اونٹ (بعض روایات میں تریسٹھ کا عدد مذکور ہے) اپنے دست مبارک سے نحر کیے اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد فرمائے. دوسری بات یہ ہے کہ خون بہانا قربت ہے اور قربت کو اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینا بہتر ہوتا ہے، کیونکہ انسان خود قربت کو خشوع و خضوع سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے. البتہ اگر اسے ذبح کرنا آتا ہی نہ ہو یا اچھی طرح ذبح نہ کر سکتا ہو تو پھر دوسرے کے سپرد کیا جا سکتا ہے.

**مسئلہ** : امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ جانور کی جھول اور رسی وغیرہ کو بھی صدقہ کر دے. قصاب کو اجرت کے طور پر نہ دے. آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا تھا کہ اس کی جھول اور رسی وغیرہ بھی صدقہ کر دے اور ان میں سے قصاب کی اجرت نہ دینا.

**مسئلہ** : جو شخص بدنہ لے کر چلے (اور راستے میں کسی عارضے کی وجہ سے پیدل نہ چل سکے) اور سواری کرنے پر مجبور ہو جائے تو سوار ہو سکتا ہے. اگر مجبوری نہ ہو تو سوار نہ ہو ، کیونکہ اس نے بدنہ کو خالصۃ رضاء الٰہی کے حصول کے لیے مخصوص کر دیا ہے .

لہذا یہ بات مناسب نہیں کہ اس کے حرم میں پہنچ جانے سے پہلے اب وہ اس سے کوئی ذاتی نفع یا آرام حاصل کرے . ہاں اگر سوار ہونے کی مجبوری در پیش ہو (اور اس کے پاس سواری کا کوئی دوسرا انتظام نہ ہو تو اس اضطرار کے تحت سواری کر سکتا ہے) . روایت کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ کی مہار پکڑے جا رہا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا: بھلے آدمی اس پر سوار کیوں نہیں ہو جاتے ؟

اس حدیث کی تأویل یہ ہے کہ وہ شخص عاجز و محتاج تھا (اسے چلنے میں دقت پیش آرہی تھی تو آپ ﷺ نے از راہ ترحم اسے سوار ہونے کو فرمایا) .

**مسئلہ** : اگر اونٹ پر سواری کرنے کی وجہ سے اونٹ میں کمزوری یا کمی آ جائے تو وہ اس نقصان کی تلافی کرنے کا ضامن ہوگا . اگر ھدی شیر دار ہو تو اس کا دودھ نہ دوھے ، کیونکہ دودھ اس کے جسم

سے پیدا ہوتا ہے ، لہذا اسے اپنی ضرورت کے کام
میں نہ لائے .

اس کے تھنوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے
تاکہ دودھ ختم ہو جائے . یہ صورت اس وقت ہوگی
جب جانور کے ذبح کرنے کا وقت قریب ہو . اگر
ذبح کرنے میں زیادہ عرصہ ہو تو جانور کو دوہ کر
دودھ صدقہ کر دیا جائے ، کیونکہ اگر دودھ نہ نکالا
جائے تو جانور کو تکلیف ہوتی ہے . اگر دودھ کو
اپنے کام میں لائے تو اسی قدر دودھ یا اس کی قیمت
صدقہ کر دے ، یہ اس کی ذمہ داری ہے .

مسئلہ : اور جو شخص ہدی ساتھ لے کر جارہا ہو
لیکن ہدی راستے میں ہلاک ہو جائے ، اگر تطوع یعنی
نفلی ہو تو اس پر دوسرا جانور خریدنا واجب نہ ہوگا .
کیونکہ قربت کا تعلق تو اس جانور سے تھا اور وہ
جاتا رہا .

اگر جانور کسی واجب (امر) سے ہو تو اس کی
جگہ دوسرا خریدے ، کیونکہ واجب تو اس کے ذمے
باقی ہے .

اگر جانور کو کوئی کثیر عیب لاحق ہو جائے
تو اس کی جگہ دوسرا خریدا جائے . کیونکہ اس قسم
کے عیب دار سے واجب ادا نہیں ہوا کرتا . لہذا

دوسرا خریدنا ضروری ہوگا ، اور عیب دار جانور کے ساتھ جو چاہے کرے (فروخت کرے یا صدقہ کرے) یہ اس کی مملوکہ اشیاء میں شامل ہوگیا ہے .

مسئلہ : اگر نفلی بُدنہ راستے میں مرنے کے قریب پہنچ جائے تو اسے ذبح کر دے اور اس کے قلادے کو خون آلود کرکے کوہان کی ایک جانب (نشان) لگا دے . اس کا گوشت نہ تو یہ خود کھا سکتا ہے اور نہ دوسرے امیر لوگ . حضور ﷺ نے ناجیة الأسلمی کو یہی فرمایا تھا . نعل سے مراد قلادہ ہے اور اسے خون آلود کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ یہ ھدی ہے اور اس میں سے صرف فقراء کے لیے کھانا جائز ہے اغنیاء کے لیے نہیں .

(صاحب ھدی کو کھانے سے اس لیے روکا گیا) کہ کھانے کی اجازت حرم تک پہنچ جانے کے ساتھ مشروط ہے . (اور اس ھدی کو حرم سے پہلے ہی ذبح کر دیا گیا) تو اس کا کھانا کسی کے لیے بھی جائز نہ ہونا چاہیے تھا . لیکن فقراء کے عجز و فقر کے مدنظر ان کا کھانا درندوں کے کھا جانے سے افضل ہے (لہذا فقراء کھا سکتے ہیں) . دوسری بات یہ ہے کہ فقراء کے کھانے میں تقرب بھی ہے اور یہ تقرب ہی تو مقصود تھا .

اگر (راستے میں مرنے والا بدنہ) کسی واجب

سے ہو تو اس کی جگہ دوسرا جانور خریدے اور پہلے کے ساتھ جو چاہے کرے . کیونکہ جس مقصد کے لیے اس نے معین کیا تھا وہ صلاحیت تو باقی نہ رہی . اب یہ اس کی مملوکہ اشیاء میں داخل ہوگا .

مسئلہ : تطوع ، تمتع اور قران کے ھدی کو قلادہ ڈال دے کیونکہ یہ دم نسک ہیں اور تقلید سے اسی کا اظہار مقصود ہے . نیز اس میں تشہیر کا پہلو بھی ہے ، لہذا قلادہ ڈالنا مناسب ہوگا .

مسئلہ : دم احصار اور دم جنایات کو قلادہ نہ ڈالے کیونکہ ان کا سبب جنایۃ ہے ، اور جنایۃ کی پردہ داری مناسب ہوتی ہے ، اور دم احصار چونکہ دم جبر کے زمرے میں شمار ہوتا ہے ، لہذا یہ بھی قلادہ ڈالنے میں جنایات سے لاحق ہوگا .

امام قدوریؒ نے متن میں لفظ ھدی ذکر کیا ہے مگر اس سے مراد اونٹ ہے . کیونکہ بکری کو قلادہ ڈالنے کا رواج نہیں . نیز ہمارے نزدیک بکری کو قلادہ ڈالنا مسنون بھی نہیں . کیونکہ تقلید کا کوئی فائدہ نہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں . (اگر بکری کبھی گم ہو جائے تو پھر اس کا ملنا محال ہوتا ہے . شاید جنگل میں رات کو کسی بھیڑیے کا نوالہ بن جائے.

وَاللّٰہُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ

مَسَائل مَنثُورَۃ

# حج کے متفرق مسائل کا بیان

**مسئلہ :** لوگوں نے دن کے وقت میدان عرفات میں وقوف کیا اور کچھ لوگوں نے آ کر شہادت دی کہ تم سب نے نحر کے دن وقوف کیا ہے ، (یعنی کچھ لوگ قاضی کے پاس حاضر ہوکر شہادت دیں کہ ہم نے ذی الحجۃ کا چاند فلاں دن دیکھا ہے اور اس لحاظ سے آج ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے . جسے آپ نے غلطی کی بناء پر نویں سمجھا ہوا ہے) تو وقوف کرنے والوں کا وقوف صحیح ہوگا . قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کا وقوف درست نہ ہو ، جیسا کہ وہ اگر ترویہ کے دن وقوف کریں (یعنی لوگوں نے عرفات میں وقوف کیا اور کچھ لوگوں نے آ کر شہادت دی کہ آج تو آٹھویں تاریخ ہے ، تو شاهدین کی شہادت قبول کی جاتی ہے اور وقوف جائز نہیں ہوتا) . دوسری بات یہ ہے کہ وقوف ایسی عبادت ہے جو زمان و مکان دونوں سے مخصوص ہوتی ہے ، لہذا ان دونوں کے سوا اسے عبادت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا .

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہادت ایک منفی امر پر قائم ہوئی ہے اور ایک ایسے امر پر جو قضاء قاضی کے تحت داخل نہیں (کیونکہ اس مذکورہ صورت میں فیصلہ قاضی کے اختیار میں نہیں کہ لوگوں کا حج مقبول ہے یا غیر مقبول ، بلکہ قبولیت اور عدم قبولیت اللہ تعالی کے اختیار میں ہے ۔ بعض امور قضاء قاضی کے تحت داخل ہوتے ہیں ، مثلاً قاضی کے پاس شہادت دی گئی کہ فلاں شخص نے طلاق دیتے وقت أَنْتِ طَالِقٌ ثَلاثٌ میں کلمۂ استثناء ذکر نہیں کیا ۔ خاوند اس شہادت سے منکر ہے ۔ یہ صورت شہادت علی النفی کی ہے ۔ مگر قضاء قاضی کے تحت داخل ہے اور قاضی اس میں فیصلہ دے سکتا ہے) ، کیونکہ اس شہادت سے مقصد لوگوں کے حج کی نفی کرنا ہے ۔ مگر حج قضاء قاضی کے تحت داخل نہیں ، لہذا شہادت ناقابل قبول ہوگی ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ابتلاء عام ہے جس سے احتراز ممکن نہیں ، کیونکہ اب تو تدارک اور تلافی کی بھی کوئی صورت باقی نہیں ۔ اگر لاکھوں انسانوں کو حج کے اعادے کا حکم دیں تو لوگوں کے لیے اس میں انتہائی درجے کی پریشانی اور حرج ہے (ساری دنیا میں ایک شور بپا ہو جائے گا) ، لہذا ضروری ہے کہ اشتباہ کی صورت میں اسی وقوف کو کافی اور جائز شمار کیا جائے ۔ ترویہ کے دن وقوف کی صورت اس سے

تلف ہے ، کیونکہ غلطی ثابت ہو جانے پر فی الجملہ تدارک ممکن ہے کہ یوم عرفہ کے بارے میں شک زائل کر لیا جائے (اور یقینی صورت پر عمل درآمد کیا جائے اگر وقوف واقعی آٹھویں تاریخ کو ہوا ہو تو دوسرے دن کے وقوف کا حکم دیا جائے۔ اور اگر پہلا وقوف نویں تاریخ کو تھا تو پھر کوئی شک و شبہ نہ رہا) ۔

تیسری بات یہ ہے کہ جواز مؤخر کی تو کئی نظیریں موجود ہیں (مثلاً نماز کی قضاء ، روزے کی قضاء ۔ قضاء ہمیشہ اصل وقت کے بجائے مؤخر وقت میں ہوتی ہے ۔ لہذا مذکورہ بالا شہادت کی صورت میں کہ وقوف یوم نحر کو ہوا ہے وقوف کو جائز قرار دیا جائے گا ، کیونکہ اگر وقوف کا دن واقعی نو ذی الحجۃ کا دن تھا تو وقوف مناسب وقت میں ہوا ۔ اگر خدا نخواستہ دسویں تاریخ تھی تو اسے بھی قضاء کے زمرے میں شامل کر لیا جائے گا کہ کم از کم حج کی قضاء تو کر لی گئی) ۔ لیکن یوم ترویہ کی صورت میں یہ ممکن نہیں ، کیونکہ جواز مقدم کی کوئی صورت نہیں ۔ (یعنی یہ ممکن نہیں کہ نماز اپنے وقت سے پہلے ادا کرلی جائے ۔ یا فرض روزہ رمضان سے پہلے رکھ لیا جائے ۔ اسی طرح اگر وقوف یوم ترویہ کو ہوا ہے تو اگلے دن وقوف واجب ہوگا ، کیونکہ وقت سے قبل ادائیگی مشروع نہیں ہوتی) ۔

اصحاب ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ حاکم کو چاہیے کہ ایسی شہادت کو در خور اعتنا نہ جانے اور اعلان کر دے کہ لوگوں کا حج مکمل ہو چکا ہے اور وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ ورنہ شہادت کو تسلیم کرنے کی صورت میں ایک عظیم فتنے کے وقوع کا خدشہ ہے۔

اسی طرح اگر کچھ لوگ عرفہ کی شام کو آکر شہادت دیں کہ جس روز ہم نے چاند دیکھا تھا، اس کے حساب سے لوگوں کو غلطی ہوئی ہے، کیونکہ لوگ مکہ مکرمہ سے جس دن آٹھویں تاریخ سمجھ کر نکلے تھے وہ در حقیقت نویں تاریخ تھی۔ لیکن اب باقی رات میں تمام یا اکثر لوگوں کے ساتھ وقوف ممکن نہیں رہا (کہ پھر سارے کے سارے لوٹ کر میدان عرفات میں جائیں اور وقوف کریں)، تو اس پر بھی عمل نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ: امام محمدؒ جامع صغیر میں فرماتے ہیں: جس نے دوسرے دن یعنی گیارھویں تاریخ کو جمرۂ وسطی اور ثالثہ پر کنکریاں ماریں اور جمرۂ اولی کو چھوڑ دیا، اگر پھر رمی کی ابتداء کرتے ہوئے پہلے جمرے پر کنکریاں مارے اور پھر باقی دونوں پر تو درست ہوگا بلکہ یہ افضل صورت ہوگی، کیونکہ مسنون ترتیب کو مد نظر رکھا گیا۔ اور اگر صرف پہلے جمرے پر

رمی کر دی تب بھی جائز ہوگا ، کیونکہ اس نے متروک کی تلافی اپنے مناسب وقت میں کر لی . البتہ ترتیب کا تارک ہوگا .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جائز نہ ہوگا جب تک کہ تمام جمرات کا اعادہ نہ کرے ، کیونکہ رمی بالترتیب ہی مشروع ہے . اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ طواف سے پہلے سعی کرے ، یا سعی کی ابتداء صفا کی بجائے مروہ سے کرے .

احناف کہتے ہیں کہ ہر جمْرہ مستقل طور پر قربت مقصودہ ہے ، لہذا جواز کا تعلق اس امر سے نہ ہوگا کہ فلاں بعض کو بعض پر مقدم کرے . بخلاف سعی کے ، کیونکہ سعی تو طواف کے تابع ہوتی ہے اور سعی کا درجہ طواف سے کمتر ہے . اور مروہ کا منتہاء سعی ہونا نص سے ثابت ہے ، اس لیے مروہ سے سعی کا شروع کرنا درست نہ ہوگا .

مسئلہ : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں : جس شخص نے اپنے اوپر لازم کیا کہ وہ پیدل حج کرے گا ، تو طواف زیارت کرنے تک وہ سواری نہیں کر سکتا . مبسوط سے پتا چلتا ہے کہ اسے پیدل چلنے اور سوار ہونے میں اختیار ہے . اور الجامع الصغیر کی عبارت سے وجوب کا پتا چلتا ہے . اور صحیح بات یہی ہے . کیونکہ اس نے قربت کو ایک خاص صفت

(پیدل چل کر جانے) کے ساتھ اپنے اوپر لازم کیا ہے،
لہذا قربت کا حصول اسی صفت کے ساتھ لازم ہوگا.
جیسا کہ مسلسل روزے رکھنے کی نذر مانے (تو اسے
مسلسل ہی رکھنے ہوں گے). ارکان حج طواف زیارت کر
لینے سے مکمل ہو جاتے ہیں، لہذا طواف زیارت کرنے
تک پیدل چلے.

(اب رہا یہ سوال کہ کہاں سے پیدل چلنا شروع
کرے)، بعض فقہاء نے کہا کہ جب احرام باندھ لے
تو پیدل چلنا شروع کرے. بعض حضرات کے نزدیک
گھر سے پیدل چلنا ضروری ہے، کیونکہ ایسی نذر میں
یہی مراد لینا صحت کے زیادہ قریب ہے، اگر کہیں
راستے میں سوار ہوا تو اس کے ذمے دم ہوگا، کیونکہ
اس نے اپنے اوپر لازم کردہ امر میں نقص پیدا کیا
(اور نقص کی تلافی کے لیے دم ہوا کرتا ہے). فقہاء نے
مبسوط اور الجامع الصغیر کی روایات میں توافق پیدا
کرنے کے لیے کہا: اگر سفر دور دراز کا ہو اور اس
کے لیے پیدل چلنا باعث مشقت ہو تو سواری کر لے.
لیکن جب مسافت تھوڑی ہو اور وہ شخص پیدل چلنے
کا عادی بھی ہو اور اسے پیدل چلنے میں کسی دقت کا
سامنا نہ ہو، تو پھر پیدل چل کر جائے.

مسئلہ: اگر کسی شخص نے ایسی محرم لونڈی
خریدی جس کو اپنے آقا کی طرف سے احرام باندھ

اجازت تھی، تو خریدار کے لیے جائز ہے کہ اسے احرام کھولنے کو کہے اور اس سے مباشرت کر لے. (احرام کھولنے کی یہ صورت ہے کہ ممنوعات احرام سے کوئی فعل کر لے مثلاً بالوں کا قصر ہی کر لے).

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ خریدار کو تحلیل کرانے کا کوئی حق نہیں کیونکہ لونڈی کا احرام ایسا عقد ہے جسے مشتری کی ملک سے سبقت حاصل ہے، لہذا اس عقد کو فسخ کرنا اس کے اختیار میں نہیں، جیسا کہ کوئی شخص منکوحہ باندی خریدے تو وہ فسخ نکاح کا مالک نہیں ہوگا کیونکہ عقد نکاح اس کی ملکیت سے پہلے کا ہے).

ہماری دلیل یہ ہے. کہ اب مشتری بائع کے قائم مقام ہے اور بائع کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اس کا احرام کھول سکتا. اب وہی اختیارات مشتری کو حاصل ہوں گے. البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بائع کے لیے بھی تحلیل مکروہ ہے، کیونکہ اس نے خود احرام کی اجازت دی ہے تو تحلیل سے وعدے کا خلاف لازم آتا ہے. لیکن یہ (خلاف عہد والی) بات حق مشتری میں نہیں پائی جاتی. بخلاف منکوحہ لونڈی کے. کیونکہ جب بائع اپنی اجازت سے نکاح کرائے تو اب نکاح کے فسخ کرنے کا اسے کوئی اختیار نہیں (بلکہ فسخ کا حق تو زوج کو حاصل ہے) اور اسی طرح

مشتری کو بھی حاصل نہ ہوگا۔

جب مشتری کو تحلیل کا حق حاصل ہے تو ہمارے نزدیک وہ عیب کی بناء پر بیع کو رد نہیں کر سکتا (کہ اس میں تو احرام والا عیب یعنی پابندی موجود تھی۔ مجھے سودا منظور نہیں۔ ہمارے نزدیک سودا ناقابل رد ہے۔ کیونکہ اسے تحلیل کا اختیار ہے) امام زفرؒ کے نزدیک وہ بیع کو رد کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے لیے مباشرت ممنوع ہے۔

الجامع الصغیر کے بعض نسخوں میں ویجامعہا کی بجائے أو یجامعہا ہے۔ متن والے نسخے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ جماع کے بغیر بھی تحلیل کر سکتا ہے مثلاً اس کے کچھ بال کاٹ دے یا ناخن کاٹ دے اور اس کے بعد جماع کرے۔ دوسرے (یعنی أو والے) نسخے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جماع سے تحلیل کرے، کیونکہ جماع سے پہلے بدن کا چھونا وغیرہ تو پایا جاتا ہے جس سے تحلیل ہو جاتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ حج کے تقدس اور عظمت کے پیش نظر جماع کے بغیر ہی تحلیل کرے۔

واللہ اعلم

(الحمد للہ کتاب الحج ختم ہوئی۔

العبد الضعیف غازی احمد یکم ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ)